(۵۳)اردو میں غیر افسانوی ادب ایک جائزہ،مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی صفحہ 8

(۵۴)اردو ادب کی تحریکیں ابتدا تا ۱۹۷۵ء، ڈاکٹر انور سدید، کتابی دنی دہلی 2008صفحہ 49-348

(۵۵)ایضاً صفحہ 471

(۵۶)اردو میں رپورتاژ نگاری کا فنی جائزہ، ماہنامہ فکر و تحقیق دہلی، جولائی 2015

تیسرا باب: عابد سہیل کی خودنوشت نگاری

الف: اردو میں خودنوشت نگاری کی روایت

ب: عابد سہیل کی خودنوشت "جو یاد رہا" کا تنقیدی مطالعہ

☆ خودنوشت کی تعریف

اس دنیا میں انسان کے لئے سب سے پیاری چیز" زندگی" ہے۔اس کو سجانے سنوارنے اور بہتر سے خوب تر بنانے کے لئے انسان منصوبے بناتا ہے، ترکیبیں سوچتا ہے اور ہر قدم سوجھ بوجھ کر رکھتا ہے۔ان تمام تر اہتمام کے باوجود زندگی پر اس کا بس نہیں چلتا ہے۔وہ من مطابق زندگی نہیں گزار پاتا۔زندگی کا ہر موڑ اسے ایک نئے تجربہ سے ہمکنار کراتا ہے۔اس کی زندگی میں ایسے حادثات پیش آتے ہیں جس کا وہم وخیال بھی اس کے ذہن میں نہیں ہوتا۔ یہ حادثات اتنے شدید اور پر اثر ہوتے ہیں کہ انسان کا طرز حیات ہی بدل دیتے ہیں۔کبھی کوئی "ذرّہ" "آفتاب" بن جاتا ہے اور کبھی خورشید نصف النہار، خاموش سمندر میں ڈوب جاتا ہے۔ان سرد و گرم اور سخت و نرم حالات سے گزرنے کے بعد جب انسان اپنی زندگی پر نظر ڈالتا ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے زندگی تو ایک افسانہ ہے جس میں ہر لمحہ تجسس ہے، نئے نئے کردار ہیں، عروج ہے، زوال ہے، محبت ہے نفرت ہے، فتح ہے شکست ہے، الغرض ہر وہ عنصر موجود ہے جس سے ایک بھرپور افسانہ تیار کیا جا سکتا ہے بس فرق اتنا ہے کہ وہ حقیقت سے قریب ہوتا ہے اور زندگی حقیقت ہوتی ہے۔لوگ زندگی کی یہ حقیقت دوسروں کو بتانے کے خواہاں ہوتے ہیں۔اس میں کامیابیوں پر افتخار بھی شامل ہوتا ہے اور لغزشوں پر عبرتیں بھی۔ جب زندگی کی یہی حقیقت صوتی بیانیہ سے نکل کر تحریری انداز اختیار کر لیتی ہے تو وہ خودنوشت کہلاتی ہے۔

اس زندگی کے بیانیہ کو ماہرین نے اپنے اپنے انداز میں متعارف کرایا ہے جن کی مدد سے خودنوشت کے حدود متعین کئے گئے ہیں تا کہ ایک معیاری خودنوشت کی اصول سازی ممکن ہو سکے۔مثلاً

Cassells Encyclopaedia of LIterature

میں خودنوشت کے بارے میں یہ الفاظ درج ہیں

> Autobiography is the narration of man's life by himself.It should contain a greater guarantee of truth than any other form of biography since the central figure of the book appears also a witness of the events which he records

Johnson was of the opinion that no man's life could be better written than by himself and it does seem as though an honest author should be more fully equipped than any body else to give a complete account of his own experiences.

"خودنوشت کسی انسان کی زندگی کی وہ روداد ہے جسے وہ خود بیان کرے اس میں سوانح حیات کی کسی بھی دوسری شکل سے زیادہ صداقت کی ضمانت ہونی چاہئے کیونکہ کتاب کی مرکزی شخصیت ایسے گواہ کے طور پر بھی پیش ہوتی ہے جنھیں وہ قلم بند کرتی ہے جانسن کی رائے یہ تھی کہ کسی شخص کی زندگی کا حال خود اس سے بہتر کوئی نہیں لکھ سکتا اور امر واقعہ یہ ہے کہ ایک ایماندار مصنف کو اپنے تجربوں کا پورا حال بیان کرنے کے لئے کسی بھی دوسرے شخص کے مقابلے میں معلومات سے زیادہ مکمل طور پر لیس ہونا چاہئے۔"(۱)

وہاج الدین علوی اس صنف کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں

"۔۔۔خودنوشت سوانح حیات ادب کی وہ تخلیقی صنف ہے جو کسی فرد واحد کی زندگی کے اہم ادوار پر محیط ہوتی ہے اور اسی کے قلم کی رہین منت ہوتی ہے جس کے آئینہ میں اس فرد کی داخلی اور خارجی زندگی کا عکس براہ راست نظر آتا ہے اور اس کا عہد بھی جلوہ گر ہوتا ہے۔"(۲)

منجملہ خودنوشت وہ تحریر ہوتی ہے جس میں انسان اپنی زندگی کے اہم واقعات کو پوری سچائی کے ساتھ قلمبند کرتا ہے اور یہ واقعات قاری کے سامنے خودنوشت نگار کی مکمل تصویر پیش کرتے ہیں۔

☆اردو میں خودنوشت نگاری کی روایت

خودنوشت کا شمار اردو ادب کی ان چند اصناف میں ہوتا ہے جنھوں نے اردو نثر کے سرمایہ کو مستحکم اور ثروت مند بنایا۔ یوں تو اس کے دھند ھلکے نقوش صوفیان کرام کے صحائف میں بھی ملتے ہیں جہاں وہ اپنے حالات زندگی مختصر اقلمبند کرتے ہیں۔ یا پھر قدیم مثنویوں میں بھی خودنوشت کے ابتدائی آثار دیکھنے کو ملتے ہیں جس میں شاعر اپنے بارے میں کچھ باتیں نظم کرتا ہے۔لیکن اس قدیم دور میں اظہار ذات کے لئے کوئی مبسوط تحریر نہیں لکھی گئی۔ممکن ہے لوگ اس کو خودنمائی سے تعبیر کرتے ہوں یا پھر یہ حق اس وقت کے بادشاہ وامرا کو ہی حاصل رہا ہو اسی لئے عوامی سطح پر زندگی کو منظم طریقہ سے نقل کرنا رواج نہ پا سکا ہو۔

اردو ادب میں شعوری طور پر حالات زندگی تحریر کرنے کا آغاز جنگ آزادی یعنی 1857 کے بعد ہوا۔ اس ضمن میں دو کتابیں نہایت اہم مانی جاتی ہیں۔پہلی جعفر تانیسری کی " تواریخ عجیب " جو" کالا پانی " کے نام سے بھی مشہور ہے۔اور دوسری عبدالغفور نساخ کی "خودنوشت سوانح حیات نساخ" جسے عبدالسبحان نے ترتیب دیا۔

جعفر تھانیسری نے اپنی آپ بیتی 1885 میں قلم بند کی جس میں انڈمان کے حالات زندگی اور مصنف کے قید و بند میں گزارے گئے روز وشب کا بیان ہے۔اس کتاب میں مصنف کے تمام حالات زندگی نہیں ہیں اور اس کی وجہ صاحب کتاب نے تمہید میں واضح بھی کردی۔وہ لکھتے ہیں۔

> "میری واپسی انڈمان کے بعد جب ہر ایکدوست نے جس سے میری مالاقات (ملاقات) ہوئی میری قید بست سالہ اور سفر اور ان جزائر کی کیفیت پوچھنی شروع کی تو ہر ایک شخص کے روبرو ایک بست سالہ تاریخ کا بیان کرنا دشوار سمجھ کر کچھ ضروری حالات و واقعات جو اس مدت بیس سال میں مجھ کو پیش آئے مختصراً واسطے ملاحظہ ناظرین کے لکھ دیتا ہوں کہ ہر سال اور مستفسر کے روبرو اس کو پیش کرو۔" (۳)

یہ مکمل خودنوشت نہ ہوتے ہوئے بھی فن آپ بیتی کے اصول مرتب کرنے میں خاصی مددگار ثابت ہوتی

ہے اور ایک اہم مقام کی حامل ہے۔اس تعلق سے ڈاکٹر صبیحہ انور اپنی کتاب میں لکھتی ہیں

"مولانا جعفر تھانیسری کی حیثیت اردو میں ادبی نہیں ہے ان کی دلچسپی قانون، مذہب اور تحریک جہاد سے تھی۔لیکن یہ بات بہر کیف تسلیم کرنا ہوگی کہ "تواریخ عجیب" کی حیثیت ایک باضابطہ اور شعوری خودنوشت سوانح حیات کی نہیں ہے تو اس چیز کی ضرور ہے جسے انگریزی میں Partial Autobiography (جزوی آپ بیتی) کہا جاتا ہے۔"(۴)

کتاب میں پہلا باب ابتدائے عشق کے عنوان سے ہے جس میں مصنف نے انگریزوں کی جانب سے اپنے خلاف ہونے والی سازش اور گھر کی تلاشی کا قصہ بیان کیا ہے۔دوسرا باب "فرار" اور تیسرا باب "گرفتاری" کے عنوان سے ہے اور اپنے عنوان کے مطابق مصنف کی روداد حیات کو سمیٹے ہوئے ہے۔اس کے علاوہ اس کتاب میں انڈومان کی زندگی وہاں کا کلچر اور باشندوں، انگریزوں کے مظالم اور انگریزی زبان سیکھنے کا تذکرہ بھی مختصراً موجود ہے،ساتھ ہی مولانا نے اپنی دوسری شادی کا بھی ذکر کیا ہے اور لارڈ میو گورنر جنرل و مولانا احمد اللہ کے انتقال کو بھی جگہ دی ہے۔اس کتاب سے مولانا جعفر تھانیسری کا مقصد اپنے ساتھیوں تک داستان قید و بند کا پہچانا تھا لہٰذا اس کتاب کی زبان سادہ اور انداز بیان زود فہم ہے۔مصنف کا یہ جملہ بھی اس بات کی تائید کرتا ہے جس میں وہ اس کو اپنے ملک کی بولی کہہ کر متعارف کراتے ہیں۔

"۔۔۔اس کتاب کو ہند میں حاضر ہو کر اپنے ملک کی بولی میں ناظرین کی نذر کروں"۔(۵)

دوسری اہم کتاب عبدالغفور خاں نساخ کی "خودنوشت سوانح حیات نساخ" ہے۔اردو ادب کی یہ پہلی کتاب ہے جس میں مصنف نے باضابطہ طور پر اپنے احوال زیست لکھنے کا ارادہ کیا۔وہ لکھتے ہیں۔

"خاکسار عبدالغفار متخلص بہ نساخ۔۔۔حسب خواہش احباب اپنی زندگی کے مختصر حالات وسوانح اس رسالہ میں درج کرتا ہے۔"(٦)

گوکہ وہ اس میں پوری طرح کامیاب نہیں ہوسکے۔محمد حامد علی خاں کا تحریر کردہ مونوگراف "عبدالغفو(ر) نساخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کو لکھنے میں کسی ترتیب کا لحاظ نہیں کیا گیا ساتھ ہی بیچ میں کئی صفحات سادے ہیں اور نمبر شماری کا اہتمام بھی بعد میں کیا گیا ہے۔مرتب نے کئی جگہ حاشیہ لگا کر باتوں کو واضح

کیا ہے اور ربط و تسلسل کے لئے غیر ضروری واقعات کو حذف کرتے ہوئے سادے صفحات پر تاریخی قطعات و اشعار درج کر دئے ہیں۔ حامد علی خاں کے مطابق یہ کتاب عبدالغفور نساخ کے انتقال کے 97 سال بعد 1986 میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کو عبدالسبحان نے انگریزی زبان میں تعارف اور پیش لفظ لکھ کر ترتیب دیا۔

مصنف نے حسب ونسب وولادت کے تحت اپنے شجرہ کا ذکر کیا ہے جو خالد بن ولید مخزومی سے ملتا ہے۔ پھر والدین کا انتقال، تیرنا سیکھنا، ابتدائی تعلیم خط ناخن کی مشق کے ساتھ ساتھ شعروشاعری سے ابتدائی شوق کا بھی ذکر کیا۔ اس کتاب میں مصنف نے اپنے تلخ وشیریں تجربات کو جگہ دی ہے اور صرف ان ہی واقعات کو احاطہ تحریر میں لائے جس سے وہ بیحد متاثر ہوئے۔ نساخ نے 1866 میں دہلی کا سفر بھی کیا یہاں ان کے ملاقاتیوں مثلاً صدر الدین آزردہ، ضیا الدین خاں، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ، مولانا الطاف حسین حالی اور غالب وغیرہ کا تذکرہ ملتا ہے۔ یہاں انھوں نے غالب کی مثنوی گہر بار کا ذکر کرتے ہوئے بتایا ہے کہ مرزا غالب نے اس مثنوی کے تین چار سو اشعار ان کے سامنے پڑھے جس پر دہلی والوں کو بڑا تعجب ہوا کیونکہ غالب نے پانچ چھ برس سے کسی کے سامنے شعر نہیں پڑھے تھے۔

اس خودنوشت کے بارے میں ڈاکٹر صبیحہ انور رقمطراز ہیں

> "نساخ کی خودنوشت سے ان کی معاشی تگ ودو، ان کے زمانے کی اہم ہستیوں کے نام، ڈپٹی کلکٹر کے تجربات، مختلف علاقوں میں تبدیلی اور قیام کی مدت دلی لکھنؤ اور عظیم آباد کے سفر کا حال دیانت داری، ایمانداری اپنے شاعرانہ کما اور معاصروں سے چشمکوں اور دیگر فنون مثلاً علم نجوم، علم رمل اور فن خطاطی وغیرہ کے سیکھنے کا حال معلوم ہوتا ہے۔ مگر ان تمام تفصیلوں کے ساتھ ایک اور جذبہ جو ہر جگہ کام کر رہا ہے کہیں منھ چھپا لیتا ہے اور کہیں سامنے آن کھڑا ہوتا ہے وہ ہے نساخ کا خود پسندی اور خودستائی کا جذبہ۔" (۷)

یہ کتاب ترتیب اور مواد کے اعتبار سے خودنوشت سے بہت قریب معلوم ہوتی ہے مگر ابتدائی نمونہ ہونے کے سبب فنی خامیوں سے پاک نہیں ہے۔ اس کے باوجود اردو ادب میں خودنوشت نگاری کی راہ ہمواری میں اس کتاب کا ناقابل فراموش کردار رہا ہے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان 1857 کی جنگ کے سبب تاراج ہو چکا تھا یہاں کے باشندے لٹ چکے تھے اور عوام خستہ حال در بدر بھٹک رہے تھے۔ انگریزوں کے مظالم نے کیا عوام اور کیا خواص سب ہی کو اپنی

چیپیٹ میں لے رکھا تھا۔ یہاں تک کہ بادشاہ وقت بہادر شاہ ظفر کے سامنے ان کے بیٹوں کے سر کاٹ کر بھجوا دئے تھے۔ ان حالات میں جو بھی تحریر سامنے آ رہی تھی خواہ وہ غزل کی صورت میں ہو یا مثنوی کی صورت میں یا پھر خطوط کی شکل میں، سن 57 کے خونی رنگ سے سرخ تھی۔ یہی سبب ہے کہ جب آپ بیتی اور خودنوشت تحریر کی جانے لگی تو ان حالات کا در آنا ناگزیر تھا۔ مندرجہ بالا دونوں کتابوں میں بھی سن 57 کے حالات موجود ہیں لیکن یہ ذکر مختصراً شامل کیا گیا ہے۔ اس زمانے کی ایک اور خودنوشت ملتی ہے جس میں صاحب کتاب نے بڑے اہتمام کے ساتھ د ابواب میں اس خونی جنگ کے حالات دل سوز انداز میں بیان کئے ہیں۔

اس کتاب کا عنوان ہی "داستان غدر" قرار پایا جسے سید ظہیر لدین ظہیر دہلوی نے 1910 میں مکمل کیا تھا۔ آغا محمد طاہر نبیرۂ آزاد نے ظہیر دہلوی کے نواسے میر اشتیاق حسین نے یہ قلمی نسخہ حاصل کر کے مطبع کریمی، لاہور سے شائع کیا۔ اس کتاب کا عنوان "داستان غدر" یا "طراز ظہری" درج ہے۔ طاہر نبیرۂ آزاد نے اپنے خیالات کو ایک صفحہ میں سمیٹا ہے جس میں وہ اس کتاب کی اہمیت اس طرح بیان کرتے ہیں۔

> "یہ حضرت ظہیر کی سوانح عمری نہیں بلکہ داستان غدر ہے حضرت جیسا ذی مرتبت انسان اس انقلاب کی جن منزلوں سے گزرا ہے اس اک صحیح فوٹو اور غدر کے مفصل حالات اس سے بہتر نہیں مل سکتے۔۔۔ساتھ نثر اردو کی ابتدائی حالت اور اس زمانے کی طرز تحریر اور گفتگو کا طریقہ۔"(۸)

اس کتاب میں کل دس ابواب ہیں پہلے باب میں ظہیر دہلوی نے اپنی ولادت، تعلیم، ملازمت، شاعری کا آغاز معمول و مشاغل اور شادی وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ دوسرے باب سے آخری باب تک اپنی زندگی کے ارتقائی سفر کی تجدید کی ہے ساتھ ہی غدر کے حالات مفصل موجود ہیں جس میں ہنگامہ غدر کے آغاز سے لیکر تیموری شہزادوں کے قتل تک کی روداد لکھی ہے اس المناک سانحہ کے ذکر کے ساتھ ہی انھوں نے کچھ اشعار بطور مرثیہ بھی لکھ دئے ہیں جس سے قاری کا دل اس واقعہ سے بیحد متاثر ہو جاتا ہے۔ یہاں پر ایک بند پیش کیا جا رہا ہے۔

نہال گلشن اقبال پائمال ہوئے
گل ریاض خلافت لہو میں لال ہوئے
یہ کیا کمال ہوئے اور کیا زوال ہوئے
کمال کو بھی نہ پہنچے تھے جو زوال ہوئے
جو عطرِ گل کو نہ ملتے ملے وہ مٹی میں!

جو فرشِ گل پہ نہ چلتے ملے وہ مٹی میں(۹)

ظہیر دہلوی بہادر شاہ ظفر کے دربار میں داروغہ کی حیثیت سے مقرر تھے اس لئے دربار کے حالات سے بخوبی واقف تھے اور وہاں ہونے والے ظلم کا اثر ان پر دوسروں سے زیادہ تھا۔ چونکہ وہ ان سب حادثات کے چشم دید گواہ ہونے کے ساتھ ساتھ خود بھی مظلوم تھے اسلئے ان کی تحریر میں جذباتی کیفیت کا عنصر زیادہ نمایاں ملتا ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے دہلی کے مشاعروں، وہاں کے بازاروں، اس وقت کی زوال پذیر تہذیبی عکس کو محفوظ کر دیا ہے۔

ظہیر دہلوی نے مختلف ریاستوں میں ملازمت کی تھی مثلاً ریاست الور، ریاست ٹونک وغیرہ اور وہاں کے لوگوں اور ان کے اطوار کو نہایت قریب سے دیکھا تھا ان کی نظریں غیر معمولی اور دلچسپ چیزوں کو فوراً قید کر لیتیں ۔ ریاست الور کے ذکر میں "کتے" عنوان سے انھوں نے شکار خانے کے بارے میں لکھا ہے جہاں بھنگیوں کا داروغہ نوکر تھا جسے یہ کمال حاصل تھا کہ وہ بازاری کتوں کو شیر سے لڑا دیتا تھا اور تعجب اس بات پر ہے کہ وہ کتے شیر کر مار بھی ڈالتے تھے۔ یا پھر گھوڑے کے عنوان کے تحت وہاں کے اصطبل کا بیان کیا ہے جس میں گھوڑوں کی قیمت سے لیکر ان کی خوبیوں کو بھی رقم کر دیا ہے۔ ایک گھوڑے اسپ خور کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

> "اس کی نسبت مہاراج نے ایک بار سوداگران سے میرے سامنے کہا تھا۔ کہا اگر اس کے ساتھ کا دوسرا گھوڑا مجھ کو لا دو تو میں پچاس ہزار روپیہ دیتا ہوں"(۱۰)

مہاراجہ جے پور کے حالات میں انھوں نے محرم اور حجاج کی امداد کا تذکرہ کیا ہے کہ کس طرح تعزیہ داری کے واسطے بارہ بیڑے فوج کو ڈھائی ڈھائی سو روپیہ تقسیم ہوتے اور بیٹے پیچھے پچاس جوان کی نوکری معاف ہوتی یا پھر حجاج کو ہر سال بیس پچیس ہزار روپئے از ارادہ حج کے لئے اور چھ ماہ کی رخصت عطا ہوتی۔

ان تمام واقعات کو انھوں نے نہایت دلچسپ انداز میں بیان کر کے کتاب کی اس فضا کو معتدل اور خوشگوار بنا دیا جو سن 57 کی خونی جنگ کے ذکر سے مغموم اور ثقیل ہوگئی تھی۔

صبیحہ انور اپنی کتاب اردو میں خودنوشت سوانح حیات میں تحریر کرتی ہیں

> ظہیر دہلوی کی تصنیف "داستان غدر" اگر چہ سنہ ستاون کے واقعات کی مکمل روداد نہیں۔ لیکن سنہ ستاون کے حادثات اور تجربات زندگی کے اجزا میں مل کر اس طرح نمایاں کئے گئے ہیں کہ الم انگیز واقعہ پر تو روشنی پڑتی ہے ساتھ ہی ساتھ لکھنے والے کی سرگزشت غم اس کے تاثر کو دو چند کر دیتی ہے۔ لہٰذا یہ غدر کی

داستان بھی ہے اوراپ بیتی بھی۔(۱۱)

ظہیر دہلوی کی اس کتاب میں کچھ خامیاں بھی ہیں مثلاً واقعات کی تاریخوں کا ذکر نہیں ہے یا پھر بعض جگہ دوسروں کا ذکر اس حد تک بڑھ گیا ہے کہ مصنف کی شخصیت ذہن سے محو ہو جاتی ہے۔

اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن نظیر لدھیانوی نے صلاح الدین احمد کی نگرانی میں اکادمی پنجاب، ادبی دنیا منزل لاہور سے شائع کیا۔ اس ایڈیشن میں صلاح الدین اور نظیر لدھیانوی کی تحریروں کا اضافہ ہے جس سے اس کتاب کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

اس زمانے میں لکھی جانے والی خودنوشت یا آپ بیتی میں زیادہ تر حصہ ملک کے ابتر حالات پر مشتمل ہے جو ایک فطری بات معلوم ہوتی ہے کیونکہ ذہنوں سے نہ تو وہ خوں آشام واقعات محو ہوئے تھے اور نہ ہی شب خون کی وہ وارداتیں جنھوں نے خاندان کے خاندان ختم کر دئے تھے۔ اس کا اثر تمام شعبوں میں ایک طویل عرصہ تک دیکھنے کو ملا اور یہ کہنا مبالغہ نہیں ہوگا کہ اس کی صدائے بازگشت کو اردو ادب میں صاف طور پر سنا جا سکتا ہے۔ ان تصنیفات کے بعد سن 1919 میں دو غیر معمولی انشاء پردازوں کی آپ بیتی سامنے آتی ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور خواجہ حسن نظامی۔

مولانا ابوالکلام آزاد کا شمار نہایت سنجیدہ طبیعت اور اظہار ذات سے کوسوں دور رہنے والے افراد میں ہوتا ہے۔ ان کا حلقہ احباب تو بہت وسیع تھا لیکن وہ ہر کس و ناکس کے سامنے اپنی زندگی کی نقاب کشائی کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی خودنوشت "تذکرہ" اور "آزاد کی کہانی خود ان کی زبانی" میں قاری اس مولانا آزاد سے ملاقات نہیں کر پاتا جس کے جاننے کے لئے وہ بیقرار نظر آتا ہے۔

مولانا نے "تذکرہ" فضل الدین احمد کے اصرار پر لکھنا شروع کیا تھا۔ اولاً تو مولانا انکار کرتے رہے۔ ان کا کہنا تھا کہ مجھ سے کہیں زیادہ عظیم ہستیاں گزری ہیں ان کے حالات ابھی قلمبند نہیں کئے گئے ایسے حالات میں میری خودنوشت سوائے ایک تمسخر انگیز حرکت کے اور کچھ نہیں۔ لیکن مئی 1916 میں فضل الدین احمد نے رانچی میں مولانا سے ملاقات کی اور انھیں اپنے حالات زندگی جمع کرنے پر آمادہ کر لیا۔ مولانا نے اپنے بزرگوں کے احوال سے اس کا آغاز کیا اور اسے اتنا تفصیل سے لکھا کہ تقریباً 500 صفحات مکمل ہو گئے۔ مولانا صفحات لکھتے جاتے اور فضل الدین کو بھیجتے جاتے۔ جب خاندانی واقعات کا سلسلہ ختم ہوا تو مولانا نے اپنا قلم روک دیا اور فضل الدین احمد کے دوبارہ اصرار پر فقط 20 صفحات لکھ کر بھیج دئے اور کہا کہ اس سے زیادہ میں اپنا حال نہیں لکھ سکتا۔ فضل الدین احمد نے مولانا سے مزید حالات تحریر کرانے کا دوسرا طریقہ اپنایا اور 15 سوالوں پر مشتمل ایک سوالنامہ ان کی

خدمت میں حاضر کر اس کے جواب لکھنے کی درخواست کر دی۔ مولانا نے ان سوال کی تفصیل لکھ دی اور اس طرح مولانا کے تھوڑے بہت حالات زندگی جمع ہو گئے۔ مولانا کی یہ خودنوشت فضل الدین احمد نے دو جلدوں میں شائع کرنے کا فیصلہ کیا اور پہلی جلد میں خاندانی واقعات کے ساتھ مولانا کے ان حالات کو ترتیب دیئے جو انھوں نے مختصراً لکھے تھے۔ یہ جلد ستمبر 1919 میں البلاغ پرنٹنگ اینڈ پبلشنگ ہاؤس کلکتہ سے شائع ہوئی۔ اور دوسری جلد میں دیگر اذکار کے ساتھ 15 سوالات کے جوابات شامل کئے تھے۔ لیکن افسوس دوسری جلد شائع نہیں ہو سکی۔

اس کتاب میں مولانا کے حالات زندگی کم اور ان کے آباواجداد کے واقعات زیادہ ملتے ہیں اور جہاں مولانا نے خود کا تذکرہ بھی کیا ہے وہاں انشا پردازی کے جوہر دکھاتے ہوئے اپنی ذات کو پیچھے کر لیا ہے۔ ظاہر ہے کہ 20 سے 30 صفحات میں کسی کی سوانح کس طرح سما سکتی ہے! اور وہ بھی ایسے شخص کی جس نے مہمات اور فتوحات کے ڈھیر لگا دئے ہوں۔ مولانا کی اس کتاب میں ربط وتسلسل کی کمی ہے اور ایسا اس لئے کہ مولانا نے فقط اپنی یادداشت کے سہارے سے جو کچھ جہاں یاد آتا گیا لکھ دیا کیونکہ یہ صفحات ترتیب دیتے وقت ان کے پاس کوئی دستاویز یا کتاب موجود نہیں تھی۔ اس کتاب کے بارے میں پرویز ملک زادہ اپنی کتاب میں رقمطراز ہیں۔

> ”مولانا ابوالکلام آزاد کا ”تذکرہ“ ان معنوں میں تو یقینا آپ بیتی نہیں ہے کہ خود مصنف کے احوال وکوائف کی جیتی جاگتی تصویر اس میں کم ہیں مگر اس کے ساتھ ساتھ اگر آپ بیتی کو ہم وسیع معنوں میں دیکھیں اور سمجھیں کہ آپ بیتی صرف اپنی ذات کے تجربات تک محدود نہیں ہے بلکہ ذات کے پس پشت خاندان کے صدیوں کے تجربات کا خلاصہ ہے تو یقیناً ہم اسے ایک اچھی آپ بیتی کہہ سکتے ہیں اس لئے ان کی سیرت وعادات اور خصائل میں خاندانی اور نسلی وراثت کا بھی حصہ ہوتا ہے۔ (۱۲)

ان خامیوں کے باوجود اس کتاب نے اردو خودنوشت نگاری کی روایت کو آگے بڑھانے میں اپنا کردار ادا کیا ہے لہٰذا اسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ مولانا کی زندگی پر دوسری کتاب ”آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی“ نام سے شائع ہوئی یہ کتاب عبدالرزاق ملیح آبادی نے شائع کی تھی۔

عبدالرزاق مولانا کے ساتھ 1921 میں جیل گئے تھے جہاں انھوں مولانا سے درخواست کی کہ وہ اپنے حالات زندگی تفصیلاً تحریر فرمائیں۔ مولانا خود لکھنے پر تو راضی نہیں ہوئے لیکن انھوں نے اپنے حالات بول دئے جسے عبدالرزاق نے لکھ لیا اور 1958 میں شائع کر دیا۔ اس کتاب کو خودنوشت کے زمرہ میں رکھا جائے گا یا نہیں، یہ

جائے خود ایک موضوع بحث ہے کیونکہ مولانا نے خود حالات لکھے نہیں اور نہ ہی کتاب کے اندازِتحریر سے یہ خودنوشت معلوم ہوتی ہیں کیونکہ اس میں مولانا روای نہیں بلکہ ایک کردار ہیں اور راوی عبدالرزاق ہیں لہٰذا فنی نقطہ نظر سے اس کا شمار خودنوشت میں نہ ہوکر سوانح حیات میں کیا جاسکتا ہے۔

معروف انشا پرداز خواجہ حسن نظامی کی خودنوشت " آپ بیتی" بھی اسی سال شائع ہوئی۔ یہ آپ بیتی بھی خودنوشت کے بنیادی اصولوں پر پوری نہیں اترتی۔ اگرچہ یہ مصنف کے حالات زندگی کو خوب خوب روشن کرتی ہے لیکن اس کتاب میں شعوری طور پر ایسے واقعات کو حذف کر دئے گئے ہیں جن سے اظہار ذات کی تکمیلیت کے ساتھ ساتھ ارتباط و انظمام کو نقصان پہنچا ہے۔ اس کی روداد خواجہ حسن نظامی نے اس کتاب کے شروع میں " دیباچوں کا دیباچہ" عنوان کے تحت تحریر کر دی ہے۔ قصہ مختصر یہ ہے کہ خواجہ صاحب یہ کتاب پیر بھائیوں اور اپنے مریدوں کے تجربہ کے لئے لکھ رہے تھے اور تمام حالات نیک و بد جمع کر دینا چاہتے تھے۔ لہٰذا انھوں نے ایسا ہی کیا مگر اس بات کی اطلاع بمبئی کے کچھ تعلیم یافتہ مریدوں کو ہوگئی۔ انھوں نے اس کی سخت مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ کچھ باتوں کا مخفی رہنا ہی بندگان خدا کے لئے نفع بخش ہوتا ان کا اظہار انھیں نقصان پہنچا سکتا ہے۔ اس بات کی تائید خواجہ حسن نظامی کے کچھ اور رفقا نے بھی کی جن میں ولی محمد مومن اور غلام نظام الدین قریشی پریمی احمد آبادی وغیرہ شامل تھے۔ لیکن دوسری جانب کچھ ایسے دوست بھی تھے جو یہ چاہتے تھے کہ تمام واقعات بے کم و کاست ہونا چاہئے جس میں مولوی عبدالماجد وغیرہ تھے۔ آخرکار خواجہ نظامی نے اکبرالہ آبادی جن کی وہ بہت عزت کرتے تھے اس بابت مشورہ کیا اور اکبرالہ آبادی نے انھیں اس کام سے روک دیا۔ یہ اقتباس دیکھیں

> " اسی اثنا میں حضرت مولانا سید اکبرحسین صاحب جج الہ آبادی کا حکم پہنچا کہ جن سے میں نے مشورہ لیا تھا کہ وہ واقعات ہرگز درج نہ کئے جائیں ان سے کچھ حاصل نہیں۔ حضرت اکبر کے ارشاد کے بعد میں مجبور ہوگیا کیونکہ میرے عقیدہ میں ان کی رائے تمام ہندوستان کے باشندوں کے مقابلہ میں بھی زیادہ وزنی تھی۔ اسی زمانہ میں جناب اللہ بندی عرف امی صاحبہ نے ریاست کوئٹہ سے حضرت اکبر کی تائید میں ایک مستند خط لکھا جس میں آیات واحادیث واقوال مشائخ کے حوالے جمع کرکے مجھ کو اس حرکت سے روکا گیا تھا۔۔۔ ان دوخطوط کو دیکھنے کے بعد میں نے مجبوراً بادل ناخواستہ کاپی نویس کو منع کر دیا کہ ان حالات کو کتاب میں نہ لکھا جائے"۔ (۱۳)

اس اقتباس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ شعوری طور پر ایسے واقعات کو نکال دیا گیا ہے جس میں شخصیت کے نقائص یا کمزوری نمایاں ہورہی تھی۔ یہ عمل خودنوشت نگاری کے خلاف ہے کیونکہ اس صنف میں صدق گوئی اور جرات مندانہ اظہار سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ خواجہ صاحب کے اس عمل کی مخالفت محمد احسان الحق قادری ایڈیٹر رسالہ اسوۂ حسنہ دہلی نے اپنے دیباچہ میں ان الفاظ میں کی

"۔۔۔جولوگ خواجہ صاحب کے ساتھ عرصہ سے دوستانہ یا نیازمندانہ تعلقات رکھتے ہیں وہ بلا تامل یہ کہہ دیں گے کہ حالات مکمل نہیں ہیں اور ان میں کچھ قطع وبرید بھی ہوئی ہے اور یہی میرے نزدیک آپ بیتی میں وہ سب سے بڑا نقص ہے جس نے گو کہ اس کی نفع رسانی اور دلچسپی پر شاید زیادہ مصر اثر نہیں ڈالا ہے لیکن اسکے موضوع تالیف یعنی تاریخی اہمیت کو یقیناً گھٹا دیا ہے۔" (۱۴)

اگر چہ خواجہ صاحب نے بہت سے واقعات کو حذف کر دیا ہو لیکن یہ کہنا مناسب نہیں کہ اس کتاب میں خودستائش کے علاوہ کچھ اور نہیں کیونکہ زندگی کے نشیب وفراز میں مصنف نے جہاں جہاں ٹھوکر کھائی ہے اس کو لکھنے میں ذرا بھی ہچکچاہٹ سے کام نہیں لیا ساتھ ہی ان باتوں کی نقطہ چینی بھی بے باکی سے کی جن پر لب کشائی ایک طوفان بدتمیزی کو جنم دے دیتی ہے مثلاً اپنے بچپن کی چوری کا ذکر کرنے کے ساتھ ساتھ وہ درگاہ میں رہنے والوں کی چوری کا حال بھی بیان کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ کس طرح سے وہاں لوگ ایک دوسرے کی غیر موجودگی میں اس کا حصہ غائب کر دیتے ہیں۔ مصنف نے اس میں اپنے جذبات ومحبت کا اظہار بھی کیا ہے اور پند ونصائح سے بھی کام لیا ہے۔

خواجہ صاحب اظہار بیان پر غیر معمولی قدرت رکھتے تھے۔ انھوں نے ایسے موضوعات پر قلم اٹھایا جن کو ماضی میں کبھی موضوع بحث نہیں بنایا گیا تھا۔ اس کی مثالیں ان کے تحریر کردہ انشائیوں میں روشن ہیں۔ اس خدا داد صلاحیت کا استعمال انھوں نے اپنی خودنوشت میں بھی کیا اور زبان وبیان کو سادہ اور شستہ رکھنے کے ساتھ ساتھ قاری کی دلچسپی کو بھی باندھے رکھا۔

یہ دونوں خودنوشتیں (تذکرہ اور آپ بیتی) مکمل طور پر فن کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتیں لیکن اس سے بھی انکار ممکن نہیں کہ ان کتابوں نے اردو خودنوشت نگاری کو ادبی راہوں کا سفیر بنا دیا جس میں ادبی ودلکش زبان وبیان کے ساتھ ساتھ واقعات کو منظم طور پر درج کرنے کی کوشش ضرور کی گئی ہے۔ اس زمانے سے لیکر 1942 تک اردو خودنوشت نگاری میں ایک سکوت سا نظر آتا ہے کوئی ایسی قابل ذکر آپ بیتی نہیں ملتی جس کو شہرت ملی ہو پھر 1943

میں دو اہم سرگزشتوں کا نام ملتا ہے جس میں پہلی سر رضا علی کی "اعمال نامہ" ہے۔

اردو ادب میں یہ خودنوشت ادبی نقطہ نظر سے سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کتاب میں نہ صرف سرگزشت حیات لکھی گئی ہے بلکہ مصنف نے آپ بیتی لکھنے کے فن سے بھی بحث کی ہے۔ رضا علی کے نزدیک خودنوشت نگاری میں دو باتوں کا خیال رکھنا بیحد ضروری ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ سچے واقعات کو کلی طور پر بیان کیا جانا چاہئے، اس کے کسی جز کو مخفی رکھنے سے واقعات کی اصل صورت مسخ ہو جاتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"دنیا میں وہ سچی بات بڑی مخدوش ہے جو آدھی ظاہر کی جائے اور آدھی چھپا ڈالی جائے"۔(۱۵)

مصنف خودنوشت نگاری میں میں تخیلات پر خواہشات کے حاوی ہونے کو معیوب سمجھتے ہیں انکا ماننا ہے اگر خودنوشت نگار اپنے حالات میں خیالات کو آزاد چھوڑ دے گا تو یہ نامہ اعمال کے بجائے ناول یا افسانہ بن جائے گا۔

اعمال نامہ کے مطالعہ کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ مصنف انگریزی ادب پر بڑی گہری نظر رکھتے تھے کیونکہ رضا علی نے انگریزی میں لکھی جانے والی سوانح اور تاریخ پر تنقید کرتے ہوئے اس کے نقائص کا ذکر کیا ہے۔ اس دیباچہ میں اردو زبان کے حوالے سے اہم گفتگو کی گئی ہے۔ مصنف نے سرگزشت لکھنے کے لئے اردو زبان کو اختیار کیوں کیا! اس کا سبب بھی یہاں ملتا ہے اور ساتھ ہی ان افراد کو جواب بھی دیا ہے جنکا ماننا ہے کہ اردو زبان مکمل طور پر مطالب کو بیان کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں

"کہا جاتا ہے کہ اردو زبان میں جامعیت وسعت نہیں معمولی خیالات کو تو اردو الفاظ کا لباس پہنایا جا سکتا ہے مگر زبان میں اتنی سمائی کہ دقیق، عملی، اقتصادی، معاشرتی اور سیاسی مطالب اس میں ادا ہو سکیں، ان مطالب کو اردو کے لفظوں کا جامہ پناؤ تو عریانی پھر بھی باقی رہتی ہے۔ ممکن ہے یہ اعتراض درست ہو ۔۔۔جواب یہ ہے کہ۔۔۔اگر آپ اپنی مادری زبان میں اپنا مطلب بلا تکلف ادا نہیں کر سکتے تو یہ آپ کی کمی استعداد کا ثبوت ہے اردو کی بے بضاعتی کی دلیل نہیں ہے۔(۱۶)

یہ حقیقت بجائے خود مسلم ہے کہ خودنوشت کی تکمیل تاریخ کے بغیر ممکن نہیں اور تنقیدی رویوں کو ہٹا کر ادب کی کسی تحریر کا جامع تصور نہیں کیا جا سکتا لیکن خودنوشت میں جب یہ دونوں عناصر (تاریخ وتنقید) مرکزی نقطہ

نظر (مصنف کی شخصیت) سے بعید ہو جائیں تو آپ بیتی تاریخ وتنقید سے زیادہ قریب ہو جاتی ہے جس سے فن کمزور ہو جاتا ہے کیونکہ قاری خودنوشت کے ذریعہ مصنف کے حالات جاننے کا خواستگار ہوتا ہے اور اس کی نظر میں مرکزی نقطہ نظر اسی کی ذات ہوتی ہے۔

علی رضا نے حالات و یادداشت کی ترتیب میں تاریخی تناسب اور واقعات کی اہمیت کو تو ملحوظ رکھا ہے مگر بہت سے مقامات ایسے ہیں جہاں مصنف کی شخصیت سرے سے غائب ہو جاتی ہے اور یہ کتاب تاریخ اور تنقید سے زیادہ قریب معلوم ہوتی ہے جو علمی اضافے کے باوجود قاری پر گراں گزرتی ہے۔ جیسے انیس ودبیر کی شاعری اور ان کا موازنہ، یا دیگر رامرا کا تذکرہ کتاب میں ایک اضافی باب معلوم ہوتا ہے۔ان چند نقائص سے صرف نظر اس کتاب نے اردو خودنوشت نگاری کو فن کی بنیاد پر استوار کرنے کی ایک کامیاب کوشش کی ہے جس کا اثر آئندہ لکھی جانے والی آپ بیتیوں میں نظر آتا ہے۔

اسی برس دوسری اہم خونوشت حکیم احمد شجاع کی "خوبہا" عنوان کے ساتھ منظر عام پر آئی۔ یہ کتاب 268 صفحات پر مشتمل ہے جس میں مصنف نے نہایت جذباتی طور پر اپنے دوستوں اور یاروں کا ذکر کیا ہے۔ مصنف نے مشہور اور نامور شخصیتوں کے علاوہ معمولی افراد کا خاکہ کھینچ کر اپنی خودنوشت میں انفراد و امتیاز قائم کیا ہے کیونکہ اس سے قبل بہ ظاہر غیر اہم افراد کا ذکر اس اہتمام سے نہیں ملتا ہے۔ وہ ایک حجام کا ذکر اس طرح کرتے ہیں۔

> "احمد بخش حجام جنہیں سر سید کے بال تراشنے کا فخر حاصل تھا اب بھی اپنے اصلاحی کام میں بڑی چابک دستی سے مصروف رہتے تھے جب وہ میرا خط بنانے آتے تو خط بناتے بناتے اولڈ بوائز کی ساری داستان حیات سناتے جاتے تھے۔"(۱۷)

اس سرگزشت کی نہایت سادہ اور دلکش زبان نے بھی اس کتاب کو اہمیت عطا کی ہے۔ ادبی لہجہ سے مملو محاورے اور تراکیب، قاری کو اپنے سحر سے آخر تک نکلنے کا موقع نہیں دیتے۔ یہ کتاب خودنوشت کی روایت کو نئے طرز تحریر سے روشناس کراتی ہے جس میں واقعات کے ساتھ ساتھ بیان کا لہجہ اور انتخاب اشخاص میں جدت نظر آتی ہے۔اس دور میں افضل حق کی آپ بیتی کا ذکر بھی ملتا ہے۔ یہ کتاب دو باب پر مشتمل ہے پہلا باب یاد ایام کے عنوان سے ہے جب کہ دوسرا باب بغیر عوان کے لکھا گیا ہے۔ زندگی کے تلخ وشیریں تجربات کے ساتھ لکھی گئی یہ آپ بیتی خودنوشت روایت کو استحکام عطا کر رہی ہے۔

"مابدولت" عنوان کے ساتھ 1945 میں شوکت تھانوی کی خودنوشت اس صنف کے سرمایہ میں اضافہ کرتی

ہے۔ یہ مصنف کے تمام حالات کا احاطہ نہیں کرسکی کیوں کہ مصنف نے ریڈیو کی ملازمت اختیار کر لی اور اس کتاب کو 1945 میں ہی شائع کرادیا۔ وہ لکھتے ہیں۔

> "ہماری آپ بیتی کا یہ پہلا حصہ ہے جو اپنی زندگی کے اس دور پر ختم ہوجاتا جس کا تعلق اخبار نویسی سے رہا۔شروع شروع میں خیال تھا کہ شاید خدا نے ہمارا رزق قلم ہی کے بہانے اتارا ہے۔اور زندگی بھر ہمیں کاغذ ہی پر روٹی ملے گی۔۔۔ مگر 1938 کے وسط میں زندگی کا دوسرا دور شروع ہو گیا اور اب گانے بجانے سے روٹی ملنے گی۔"(۱۸)

اس کتاب کے بعد شکوت تھانوی نے" کچھ یادیں کچھ باتیں" عنوان سے روزنامہ" جنگ" میں کالم لکھنے کا سلسلہ شروع کیا جس میں وہ اپنے حالات زندگی لکھا کرتے تھے۔ یہ کتاب ان کے انتقال کے بعد 1964 میں منظر عام پر آئی حالانکہ یہ بھی ادھوری ہے اور اس میں جگہ جگہ عدم تسلسل کا احساس ہوتا ہے۔ اس کتاب میں زیادہ تر وہی واقعات درج ہیں جو ما" بدولت" میں بیان کئے جا چکے ہیں۔آپ بیتی کے فنی اجزا کے زاویے سے دیکھا جائے تو" مابدولت" کی اہمیت" کچھ یادیں کچھ باتیں" سے بڑھ جاتی ہے۔شوکت تھانوی کا جدگانہ طرز بیان یہاں بھی اپنی الگ شناخت قائم کئے ہوئے ہے۔ مزاحیہ انداز کے ساتھ ہلکے پھلکے لفظوں میں باریک طنز کرنا اور پھر فلسفیانہ خیالات کو عام لب ولہجہ میں پیش کرنا، ان تمام خصوصیات نے خودنوشت کے پورے ماحول کو پرلطف بنا دیا ہے جہاں قاری زیرلب مسکراہٹ کے ساتھ شوکت تھانوی کے پیچھے پیچھے چلتا ہے۔اپنی تعلیم کا بیان وہ کچھ اس انداز سے کرتے ہیں۔

> "غالباً والدہ صاحبہ کے طعنوں سے تنگ آ کر یونہی اپنی ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے ایک دن والد صاحب نے یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ خود ہم کو فارسی پڑھایا کریں گے۔۔۔ان کا قول تھا کہ کسی کو آمد نامہ پر عبور حاصل ہے تو وہ نہایت آسانی سے شیخ سعدی بن سکتا ہے اور اگر کسی کو پہاڑے یاد ہیں تو اس کا ڈاکٹر ضیاء الدین ہوجانا نہایت آسان ہے۔۔۔اگر کبھی باپ ہوجانے کا خیال آجاتا تھا اور اس ذمہ داری کا احساس بھی پیدا ہوجاتا تھا تو فوراً پوچھ بیٹھتے تھے کہ بتاؤ نونواں؟۔۔۔اس قسم کے موقعوں پر وہ ہمیشہ ہماری تعلیم کی طرف سے مایوس ہوجایا کرتے تھے اور والدہ صاحبہ سے کہدیا کرتے تھے کہ نہ معلوم

صاحبزادے کا کیا حشر ہونے والا ہے۔ والدہ صاحبہ اس سلسلہ میں ان ہی کو ذمہ دار قرار دیتی تھیں۔ اور وہ مبحث کبھی کبھی نہایت خوفناک طوفان کی صورت اختیار کر لیتا تھا یعنی کھانے کے برتن میں شکستن کا مصدر گردانتے تھے اور طشتریاں فرش سے ضرب کھا کر اپنا پہاڑا خود ہو جایا کرتی تھیں۔"(۱۹)

شوکت تھانوی کی یہ ادھوری سرگزشت اپنے منفرد پہلو کے ساتھ خودنوشت روایت میں ایک نیا باب وا کرتی ہے۔

مذکورہ خودنوشتوں کے مطالعہ سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اب فن میں کافی حد تک استحکام آ گیا تھا اور آپ بیتیوں کی ترتیب میں واقعات کے تسلسل، زبان کی ادبیت، غیر ضروری واقعات سے گریز وغیرہ کا خیال رکھا جانے لگا تھا۔ خاصی تعداد میں اردو خودنوشت منصۂ شہود پر آ چکی تھیں۔ مابدولت کے بعد نواب چھتاری کی "یاد ایام"، مولانا حسین احمد مدنی کی "نقش حیات"، ہوش بلگرامی کی "مشاہدات" اور مجید سالک کی سرگزشت وغیرہ نے اس سفر کے تسلسل کو برقرار رکھا۔ اس کے بعد ایک ناقابل فراموش خودنوشت سردار دیوان سنگھ مفتوں کی شائع ہوئی جس میں منصوبہ بند طریقہ سے مصنف نے اپنے شب و روز تو بیان نہیں کئے ہیں مگر ایک مخصوص زمانے کے حالات کو بڑی بے باکی سے لکھ دیا ہے۔ یہ تحریر انھوں نے اپنے ہفتہ وار پرچے "ریاست" میں اسی عنوان سے شائع کرنا شروع کی تھی۔ اس تحریر میں "ریاست" کی بے باکی کا ذکر بھی ہے کہ کس طرح راجا مہاراجاؤں اور سیاسی ایوان اس پرچہ سے خوف زدہ رہتے تھے۔ اس کتاب کے شروع میں کئی معتبر ادیبوں کی آرا بھی شامل ہے۔ جس میں جوش ملیح آبادی، ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر، نیاز فتحپوری، مولانا عبدالرزاق، مالک رام وغیرہ کے نام اہم ہیں۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق اپنے مضمون میں رقمطراز ہیں

"اس (ناقابل فراموش) میں ایک ایسے شخص کے تجربوں اور مشاہدوں اور تاثرات کا بیان ہے جو عمر بھر حق کی حمایت میں باطل سے دلیرانہ مقابلہ کرتا رہا اور اس کی بدولت اس نے طرح طرح کی مصیبتیں اور عقوبتیں سہیں۔ اس پر چوری، جعل سازی، سازش، کوکین بیچنے، نوٹ بنانے کے عجیب الزامات لگائے گئے، جھوٹے مقدمات چلائے گئے اور اس کی پاداش میں اسے بارہا جیل خانے کا منھ دیکھنا پڑا۔ اس نے ایسے والیان ریاست کا مقابلہ کیا جن کی قوت اور دولت بے حساب تھی اور جنھوں نے بڑوں بڑوں کو نیچا دکھایا تھا۔"۔(۲۰)

اس خودنوشت کے بعد اردو ادب کی ایک معروف شخصیت شاد عظیم آبادی کی خودنوشت "شاد کی کہانی شاد کی زبانی" نے قارئین کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ یہ کتاب ان کے ایک شاگرد مسلم عظیم آبادی کے نام سے شائع ہوئی حالانکہ اس پوری کتاب کو شاد عظیم آبادی نے ہی لکھا تھا جس کا تذکرہ انھوں نے اپنے ایک خط میں ان الفاظ میں کیا

> "میں نے اپنی سوانح تیس جزو میں لکھ کر اپنے ایک قابل شاگرد کے سپرد کر دی ہے اور وصیت کر دی ہے کہ میرے مرنے کے بعد ضرور چھپوا کر عبرت کے لئے مشتہر کر دینا"۔(۲۱)

اس کتاب میں شاد نے ادبی سرگرمیوں کا نمایاں طور پر ذکر کیا ہے۔ اپنی نثر، شاعری، مرثیہ، وغیرہ کو بڑی تفصیل کے ساتھ لکھا ہے جس کی مدد سے ان تمام اصناف کے بدلتے منظر نامہ کو سمجھنا آسان ہوجاتا ہے۔ کئی ناقدین نے یہ بھی اعتراض کیا ہے کہ شاد نے اپنی غیر ضروری خودستائی سے بھی کام لیا ہے۔ بقول ڈاکٹر صبیحہ انور

> "شاد نے اپنی تعریف جگہ جگہ جن الفاظ میں کی ہے ان کی کھپت ظاہر ہے کہ خودنوشت سوانح حیات میں نہیں ہوسکتی"۔(۲۲)

شاد کی خودنوشت فنی واجبات کی ادائیگی میں کمزور ضرور ہے لیکن اپنے مشمولات، زبان، بیان اور حالات زمانہ کے مدنظر خود کی اہمیت کا اعتراف بہر حال کراتی ہے۔

1970 کے بعد اردو ادب میں خودنوشت سوانح میں قابل قدر اضافہ ہوا جس میں مشہور ادیبوں کی مقبول سرگزشتیں منظر عام پر آئیں۔ ان میں سب سے نمایاں 1970 میں شائع ہونے والی جوش ملیح آبادی کی خودنوشت "یادوں کی بارات" ہے۔ یہ کتاب دوسری بار 1975 میں چند اضافوں کے ساتھ شائع ہوئی۔ اس کتاب پر ناقدین نے خوب خوب تبصرے کئے اور یہ پہلی داستان حیات تھی جس میں اختلافی مسائل سے زیادہ بحث کی گئی۔ دراصل جوش ملیح آبادی نے اپنی زندگی کے ان حصوں کو بھی اس میں شامل کر دیا تھا جس کو عمومی طور پر پردۂ خفا میں رکھنا پسند کیا جاتا ہے۔ اسی لئے جوش پر مبالغہ آرائی کا بھی الزام لگا۔ اس کتاب میں باقی سب کچھ روایتی انداز میں ہی ملتا ہے جیسے خاندان کے احوال، احباب کا تذکرہ، ہمعصروں کی یادیں وغیرہ، لیکن ان سب کے علاوہ "میرے معاشقے" عنوان کے تحت 60 صفحات سے زائد کو رنگین کیا گیا ہے اور یہی وہ باب ہے جس نے یادوں کی بارات کو بہت مقبول بھی کیا اور مشہور بھی۔ ناقدین نے اس کو اخلاقی حدود سے تجاوز قرار دیا تو کچھ تبصرہ نگار نے اسے بے باکی سے تعبیر کیا کیونکہ اس طرح کی گفتگو کا رواج اردو خودنوشتوں میں نہیں تھا۔ اس کا اندازہ اس اقتباس سے کیا جاسکتا ہے

"اب رہی یہ بات کہ میں نے قیس وفرہاد کے مانند، ایک لیلیٰ اور ایک شیریں سے عشق کرنے کے بدلے، اٹھارہ معشوقوں سے عشق کیوں کیا؟ سو اس کا جواب یہ ہے کہ عمر بھر کے واسطے کسی ایک کو اپنا کر رکھنا اور کسی ایک کا ہو کر رہ جانا، میرے بس کا روگ نہ تھا۔ اس لئے کہ میرے نزدیک، یہ صورت حال معشوقیت کو زوجیت کے سیلے تہ خانے میں قید کر دینے کی بدمذاقی۔ بہتے پانی کو بند کر دینے کی عفونت انگیزی، جذبات نو بنو کا احتباس، قانونِ تغیرات کی خلاف ورزی۔ ذوق تنوع کی بے حوصلگی۔ تصور کی تہی دستی اور تخئیل کا افلاس ہے۔۔۔اس کے برعکس میں نے بھنورے کی زندگی کو اپنایا، ہر گل نو دمیدہ پر منڈلایا، اس کا گن گایا، اس کی خوشبو پی اس کا رنگ چکھا، اس پر کالی گھٹاؤں کے سائے میں گایا، گونجا، اور پھر یہ کہتا ہوا اڑ گیا

در ہیچ مقامم نہ گزارد بدر نگے

از بوئے، ببوئے برد، از رنگ برنگے (۲۳)

جوش نے اس بات کا خود اقرار کیا کہ وہ عشق کے نام پر کسی ایک خاتون کے ساتھ نہیں رہ سکتے حالانکہ آگے انھوں نے عشق سے متعلق کئی ایسے اقتباسات لکھیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ عشق کی پاکیزگی کو بخوبی سمجھتے ہیں لیکن ان کے 18 معاشقوں کا تذکرہ اور "معشوقیت کو زوجیت کے سیلے تہ خانے میں قید کر دینے کی بدمذاقی" کے بعد یہ کسی طور بھی نہیں مانا جاسکتا کہ وہ واقعی عشق کی لذت سے واقف ہوں گے۔

اس خودنوشت میں زبان و بیان اور انداز تحریر اپنے عروج پر نظر آتی ہے اور زندگی کی تاریک شاہراہوں کو روشن کرنے کے عمل نے انفرادیت بھی عطا کی ہے۔ اس "انفرادیت" کو اگرچہ ناقدین نے صرف "جعلی تشہیر" Publicity سے زیادہ کچھ نہیں سمجھا لیکن اس تحریر کے بعد کچھ حد تک سرگزشت حیات لکھنے والوں نے اپنی تہہ دار شخصیت کی پردہ کشائی سے کام لینا شروع کر دیا۔

1973 میں لکھی جانے والی "جہان دانش" بھی قابل ذکر آپ بیتی ہے۔ یہ شاعر مزدور احسان دانش کی مفلوک الحال زندگی کو بیان کرتی ہے جس میں معاشی ضروریات نے مصنف کو مزدوری، کتب فروشی، چوکیداری وغیرہ سے وابستہ کر دیا تھا۔ لیکن مصنف نے محنت اور لگن سے اپنے حالات کو خوشگوار بنایا اور کتاب کی فضا میں ایک کامیاب زندگی کے تاثر کو قائم کر دیا۔ اس کتاب میں سنین اور کہیں کہیں واقعات کی بے ترتیبی نظر آجاتی ہے جو کہ ایک عمومی بات ہے اور جس سے بچ پانا داستان حیات لکھتے وقت کے لئے ناگزیر ہوتا ہے۔ احسان دانش نے خود

اس بات کا اعتراف کیا ہے اور بتایا ہے کہ انہیں ہندسہ، نام اور راستہ یاد نہیں رہتے۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جس نے اتنی سختیاں برداشت کی ہوں اسے بھلا واقعات کی تاریخوں کا کیا دھیان ہوگا۔ احسان دانش کے مزدوری سے شاعری و نثر نگاری کے سفر نے اس خودنوشت کو نہایت دلچسپ بنا دیا ہے جس پر منظر کشی، صدق گوئی نے قاری کو مصنف سے اتنا قریب کر دیا کہ وہ دوران مطالعہ ہی احسان دانش سے پوری طرح اظہار ہمدردی کرنے لگتا ہے۔ یہ منفرد آپ بیتی ہے جس نے مفلوک الحالی سے فارغ البالی تک کے سفر کو مکمل طور پر اپنے صفحات میں جمع کر لیا ہے۔

اس دور کی ایک اور قابل ذکر خودنوشت "مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زبان میں" خواجہ غلام السیدین کی ادھوری داستان زندگی ہے جسے ان کی ہمشیرہ صالحہ عابد حسین نے "ذکر جمیل" کے ضمیمہ کے ساتھ شائع کیا تھا کیونکہ خواجہ ابھی قائم کردہ عناوین میں سے ایک تہائی عنوان مکمل کر سکے تھے کہ پیغام اجل نے حرکت قلب کے ساتھ ساتھ قلم کو بھی ساکت کر دیا۔ یہ خودنوشت ایک ایسے ماہر تعلیم کی ہے جس نے ہندوستان کے علاوہ بیرون ملک میں تعلیم حاصل کی اور وہاں کے نظام تعلیم کو سمجھا نیز اپنے وطن کے تعلیمی نظام میں خوشگوار تبدیلیاں بھی کیں۔ کتاب مذکورہ میں صرف تعلیم ہی نہیں بلکہ سیاسی، ادبی اور سماجی مسائل کا بھی احاطہ کیا گیا ہے لیکن مصنف کی خود کی ذات بہت زیادہ نمایاں نہیں ہے۔ اس کا سبب مصنف نے اس طرح بیان کیا

> "میری خواہش یہ نہیں ہے کہ اس کے ذریعہ میں بیشتر اپنی زندگی کے حالات بیان
> کروں بلکہ یہ چاہتا ہوں کہ ان لوگوں کی اچھی داستان سناؤں جس سے گزشتہ ساٹھ
> سال سے مجھے سابقہ پڑا ہے جن کی صحبت سے میں نے فیض اٹھایا ہے۔"۔(۲۴)

مصنف نے کتاب کی ہر سطر میں قلم اور جذبات کے مابین تناسب قائم رکھا ہے اور کہیں بھی یہ احساس نہیں ہوتا کہ داوات میں جذبات کے دریا کا بہاؤ کارفرما ہے لیکن "عزیز سیدین" جو کتاب کے پہلے حصہ کا اختتامیہ ہے، نہایت جذباتی انداز میں تحریر کیا گیا ہے کیونکہ یہاں خواجہ غلام السیدین نے اپنی ہمسفر "عزیز جہاں" کی مفارقت کا ذکر کیا ہے۔ تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی زوجہ سے کس حد تک محبت فرماتے تھے۔

اگر زندگی نے خواجہ غلام السیدین کو کچھ مہلت دی ہوتی تو یہ خودنوشت ایک عہد کی مکمل داستان بن جاتی جس میں تعلیمی نظام، سیاسی اتار چڑھاؤ، گمشدہ شخصیتوں کے نقوش، علی گڑھ کی تاریخ اور بیرون ملک کی آب و ہوا کی معلومات صاف اور شستہ انداز میں دستیاب ہوتی۔ بہرحال ان کی بہن کی کاوشوں سے کسی حد تک قاری کی تشنگی دور ہو جاتی ہے۔ انھوں نے اس مسودے کی اشاعت سے قبل بعض عبارتوں کے جملے میں تبدیلی کی اور کچھ انگریزی الفاظ کی جگہ اردو ترجمہ لکھ دیا اور ضمیمہ "ذکر جمیل" جس کی حیثیت خودنوشت کی نہیں بلکہ سوانح کی ہے، کے ساتھ شائع

کر دیا۔

اردو ادب میں ڈاکٹر کلیم الدین احمد کو معتبر اور متنازع نقاد مانا جاتا ہے۔ ان کی تنقید نگاری کی شہرت دور دور تک تھی اور ان کے نظریات و خیالات سے لوگوں نے موافقت بھی کی اور مخالفت بھی۔ جب کلیم الدین احمد کی خودنوشت تین جلدوں میں "اپنی تلاش میں" عنوان کے ساتھ منظر عام پر آئی تو لوگوں کو یہ اطمینان ہوا کہ اس کتاب کے ذریعہ وہ کلیم الدین احمد کے نظریات کے منبع و مرجع سے واقف ہوں گے لیکن اس معاملہ میں خاصی مایوسی ہاتھ آئی کیونکہ اس کتاب میں کلیم الدین احمد اپنی ذات سے کم اور خارجی موضوعات سے زیادہ بحث کرتے نظر آتے ہیں اور خودنوشت کے نازک مزاجی پر فلسفہ کے بیان کا بوجھ ڈال دیتے ہیں تو کہیں غیر ضروری مبحث چھیڑ دیتے ہیں۔ اس سے انکار نہیں کہ یہ تحریریں علمی اور مفید ہیں مگر "این جا درست نیست" کے باعث قاری کو بار خاطر محسوس ہوتی ہے۔

اس کتاب نے کلیم الدین احمد کی شخصیت سازی میں ان کے والد ڈاکٹر عظیم الدین، وہابی تحریک اور ادب کو اہم کڑی مانا ہے۔ ان کے والد ایک نہایت قابل شخص تھے جنہوں نے جرمنی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی۔ وہابی تحریک نے انھیں فکری طور پر بہت متاثر کیا تھا وہ مذہبی روایت، شرک اور دیگر امور پر بے لاگ اظہار کرتے ہیں۔ ادب نے ان کے خیالات کو آزادی عطا کی، فکر میں توسیع کی اور "نظر" کو سمت و رفتار کے ساتھ "نظریہ" سے ہمکنار کیا۔ یہ مثلث مصنف کی شخصیت کا پروردہ قرار پاتا ہے لیکن جس توقعات کے ساتھ ایک قاری کسی کی خودنوشت کا مطالعہ کرتا ہے یہ کتاب وہ تشنگی دور کرنے سے محروم ہے۔

برصغیر کے مقبول مزاح نگار مشتاق احمد یوسفی نے اپنی حیات کو قلمبند کرنے کا فیصلہ لیا تو اردو ادب کو 1976 میں "زرگزشت" عنوان سے ایک داستان حیات ملی جس میں زندگی کی بڑی بڑی حقیقتیں طنز کا ریشمی لباس پہنے جلوہ گر نظر آتی ہیں۔ مشتاق یوسفی ایک "سنجیدہ" مزاح نگار ہیں جنھوں نے پھکڑ پن سے کام نہیں لیا بلکہ سماج کے مسائل کو نادر و نایاب لیکن آسان تشبیہات کے ساتھ بیان کر دیا۔

یوسفی کے مطابق کتاب کی پہلی قسط 1972 میں مکمل ہو چکی تھی لیکن اس کی اشاعت کی نوبت اس وقت آئی جب ستمبر 1975 میں وہ بیماری کی وجہ سے زیادہ وقت بستر پر استراحت میں گزار رہے تھے۔ اپنے آرام کے دنوں میں انھوں نے پھر سے ایک بار اپنی زندگی کی یادوں کو تازہ کیا اور اس کتاب کو آخری شکل دی۔ اس کتاب کے سلسلہ میں وہ لکھتے ہیں

یہ سرگزشت ایک آدمی کی کہانی ہے، جس پر بحمد اللہ کسی بڑے آدمی کی پرچھائیں

تک نہیں پڑی۔ ایک ایسے آدمی کے شب و روز کا احوال جو ہیرو تو کجا ANTI - HERO ہونے کا دعویٰ بھی نہیں کرسکتا۔ عام آدمی تو بیچارہ اتنی بھی سکت اور استطاعت نہیں رکھتا کہ اپنی زندگی کو مردم آزاری کے تین مسلمہ ادوار میں تقسیم کر سکے۔ یعنی جوانی میں فضیحت، ڈھلتی عمر میں نصیحت اور بڑھاپے میں وصیت۔ (۲۵)

مشتاق احمد یوسفی نے دیباچہ کا عنوان "تزک یوسفی" رکھا اور آغاز میں ہی یہ باور کرادیا کہ پوری کتاب کا انداز بیان کیا رہے گا۔ کتاب کی ابتدا کرتے ہوئے لکھتے ہیں

ایک زمانے میں دستور تھا کہ امرا و روسا عمارت تعمیر کراتے تو اس کی نیو میں اپنی حیثیت و مرتبے کے مطابق کوئی قیمتی چیز رکھ دیا کرتے تھے۔ نواب واجد علی شاہ اپنی ایک منھ چڑھی بیگم، معشوق محل سے آزردہ ہوئے تو اس کی حویلی ڈھا کر ایک نئی عمارت تعمیر کرائی۔ معشوق محل ذات ڈومنی تھی۔ اسی نسبت سے اس کی تذلیل و تضحیک کے لئے نیو میں طبلہ سارنگی رکھوادئے۔

میں نے اس کتاب کی بنیاد اپنی ذات پر رکھی ہے جس سے ایک مدت سے آزردہ خاطر ہوں کہ "پیشہ سمجھے تھے جسے ہوگئی وہ ذات اپنی"۔ (۲۶)

اس حیات نامہ میں بینکنگ نظام اور اس سے وابستہ حالات جا بجا نظر آئیں گے کیونکہ یوسفی پیشہ وارانہ طور پر بینک سے وابستہ تھے۔ اس خودنوشت میں قلبی واردات، ذاتی لغزشات اور خارجی منظر سے معکوس ہوتی شعاؤں کو لطیف پیرائے میں سمیٹ کے پیش کردیا گیا ہے جس کی وجہ سے یہ کتاب مطالعہ کے وقت قاری کو رفتار زمانہ سے آزاد کردیتی ہے۔ بقول ڈاکٹر صبیحہ انور

اپنی حماقتوں پر خود ہنسنا اور دوسروں کو ہنسی میں شریک کرلینا ایک فن کار کی کشادہ دلی ہے۔ جو زندہ رہنے والے ادب کی پہچان ہے۔ یوسفی کی آپ بیتی اردو آپ بیتی میں ان کے اسلوب کی طرح ہی منفرد ہے۔ (۲۷)

اپنے منفرد انداز تحریر کے سبب مشتاق احمد کی یہ کتاب اردو خودنوشت کے سرمایہ میں اپنے نشان تادیر تازہ دم رکھے گی۔

اردو خودنوشتوں میں مولانا عبدالماجد دریابادی کی تصنیف " آپ بیتی" کی اہمیت بھی مسلم ہے اس کتاب کو مذہب اور ادب کے امتزاج کے طور پر دیکھا گیا۔ مولانا کی ذات اپنے زمانے کی پروقار شخصیتوں میں شمار ہوتی تھی

جس کے سبب ان کے مریدوں اورعقیدتمندوں نے ان سے احوال زندگی قلمبند کرنے کی درخواست کی۔عوام میں عقیدت کی حدتک مقبولیت بھی خودنوشت نگاری سے روکتی ہے کیونکہ عقیدتمندوں کے درمیان اپنے مرشد کی شبیہ ایک فرشتہ صفت انسان جیسی ہوتی ہے جس سے گناہ سرزدنہیں ہوسکتا۔ایسی صورت میں خودنوشت نگاری کے اصول کی پاسداری کرنا نہایت مشکل ہوجاتا ہے۔یہی صورت حال عبدالماجد دریا آبادی کو بھی درپیش تھی اور انھوں نے کتاب کے آغاز میں اس جانب اشارہ بھی کیا ہے۔

”عزیزوں، دوستوں، مخلصوں کی ایک چھوٹی سی جماعت کا اصرار ہے کہ ۷۴،۷۵ سال کی عمر کا ایک پیر نابالغ اپنی آپ بیتی دوسروں کو سنائے اور نادانیوں، سفاہتوں کی لمبی سرگزشت دنیا کے سامنے اپنی زبان سے دہرائے!۔ اللہ جانے انسان کو انسان کی پستیوں، رسوائیوں، فضیحتوں کی داستان سننے میں کیا مزہ آتا ہے! اور یہاں تو خیریت سے سادہ دل بندوں کا ایک جم غفیر اس دھوکے میں پڑا ہوہے کہ جلوے کسی عالم، فاضل، اہل اللہ کے ان صفحات میں دیکھنے میں آئیں گے اور مواعظے کسی حکیم و عارف باللہ کے سننے میں آئیں گے!۔اللہ اللہ! اس عالم آب وگل میں کسی کی صفت ستاری سے کیسے کیسے پردے، عیبوں، مجرموں، خاطیوں کے چہروں پر، اور اچھے اچھے دانش وبصیرت رکھنے والوں کی فہم ونظر پر ڈال رکھے ہیں؟۔(۲۸)

مولانا مرحوم نے اس کتاب کونہایت سلیقہ مندی سے ترتیب دیا ہے۔جس طرح زندگی چھوٹے چھوٹے قدم سے زندگی کے بڑے بڑے مسئلوں کوحل کرتی چلتی ہے اسی طرح یہ کتاب مختصر ابواب کے ساتھ درجہ بہ درجہ مولانا کی زندگی کے ارتقائی مراحل طے کرتی ہے۔اس کتاب میں کل 51 باب ہیں۔از ابتدا تا انتہا کتاب میں واقعات کی ترتیب اور تسلسل کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔شروع کتاب میں ہی مصنف نے یہ واضح کیا کہ یہ کتاب اگرچہ 1967 میں لکھی جارہی ہے لیکن اس میں واقعات آج سے 80 سال پہلے کے ذکر کئے جارہے ہیں لہٰذا اس سے وقت کی کمیت وکیفیت سے بھی آپ واقف ہوجائیں گے۔اور پھر مصنف نے ایک ”ضروری تمہید“ کے عنوان سے اپنے زمانہ قدیم سے 1947 تک کے اتار وچڑھاؤ کو بیان کیا ہے۔

اس خودنوشت کی اہمیت میں مولانا ابوالحسن علی ندوی کے پیش لفظ نے مزید اضافہ کردیا ہے۔پیش لفظ پڑھنے کے بعد کتاب سے قاری کی دلچسپی مزید بڑھ جاتی ہے اور وہ کتاب کی مکمل قرات کے لئے بیقرار ہواٹھتا

ہے۔ یہ خودنوشت ایک مذہبی راہنما کی ہے جس نے ادب کو بھی اپنایا اور قرآنی آیات پڑھنے کے ساتھ ساتھ شعر گوئی میں مہارت حاصل کی۔ اس آپ بیتی میں اپنی تصنیف و تالیف کی بھی مختصر روداد بیان کی ہے۔"یہ آپ بیتی" ان چنندہ خودنوشتوں میں شمار ہوتی ہے جس میں صداقت، مذہب، ادب اور معیاری زبان کا دریا متموج ہے۔

مذکورہ بالا خودنوشتوں کی اشاعت کے بعد اس صنف میں قابل قدر اضافہ ہو چکا تھا اور ادیبوں نے اپنے حیات نامے لکھنے میں دلچسپی کے ساتھ ساتھ جدت پسندی کو بھی شامل کر لیا تھا اگر چہ اس صنف میں بنیادی اصول اس قدر "ٹھوس" ہیں کہ ان سے نہ تو انحراف ممکن ہے اور نہ ان کی تبدیلی۔ بس ایڈوانس ہوتے زمانے میں "اخفائے راز" کی اتنی اہمیت نہیں رہی اس لئے اب خودنوشتوں میں صداقت کو نمایاں جگہ ملنے لگی ہے حالانکہ یہ زمانہ کا "ٹرینڈ" بن چکا ہے لہٰذا اس کو اقتضائے حال بھی کہا جا سکتا ہے۔

بیسویں صدی کے اواخر میں مذکورہ خودنوشتوں کے علاوہ قدرت اللہ شہاب کی "شہاب نامہ"، وامق جونپوری کی "گفتنی ناگفتنی"، میرزا ادیب کی "مٹی کا دریا"، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کی "یادوں کا جشن" ڈاکٹر وزیر آغا کی "شام کی منڈیر سے"، مرزا محمد عسکری کی "من کیستم"، عشرت رحمانی کی "عشرت فانی" وغیرہ کی سرگزشتیں اہمیت کی حامل ہیں۔

اس صنف کے آغاز سے ہی خواتین خودنوشت نگار بھی مردوں کے شانہ بہ شانہ رہی ہیں۔ پہلی خاتون خودنوشت نگار شہر بانو جن کا واقعات نامہ 1858 میں "بیتی کہانی" کے نام سے مکمل ہو چکا تھا اور منظر عام پر 1887 میں آیا۔ اس کتاب کو ڈاکٹر معین الدین عقیل نے 2006 میں اپنے تحقیقی مقدمہ کے ساتھ شائع کیا۔ جس میں انھوں نے اس کتاب اور مصنفہ کے بارے میں تمام ضروری باتوں کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں

> مصنفہ نے یہ خودنوشت ایک ایسی انگریزی خاتون مس فلیچر (Miss Flether) کی فرمائش پر تصنیف کی اور اسے پیش کی، جس سے اس کا ربط و تعلق ایک ہم سبق کا سا تھا۔ جنگ آزادی 1857 کے بعد ریاستوں کی بربادی اور زندگی کے مختلف نشیب و فراز اور زیادہ تر تکلیف دہ حالات سے گزر کر مصنفہ نے اس خودنوشت کی تصنیف کے وقت دہلی کو اپنا مسکن اور محض دل بہلانے کے لئے اس انگریز خاتون کے ساتھ درس و تدریس کا مشغلہ شروع کیا۔ مصنفہ اس کو اردو بولنا سکھاتی اور وہ مصنفہ کو لکھنا اور پڑھنا سکھاتی۔ یوں اسی مشغلے کے دوران "بیتی کہانی" بھی وجود میں آئی۔(۲۹)

اس مختصر سی خودنوشت میں مصنفہ نے اپنے حالات کے علاوہ 1857 کے واقعات اور اپنے وطن ریاست پاٹودی کی تہذیب وزندگی کو قلمبند کیا ہے۔

اس کے بعد خواتین کی جانب اس صنف میں مسلسل اضافے جاری رہے۔لیکن چونکہ اس زمانے میں خواتین کی تعلیم مردوں کی نسبتاً بہت کم تھی اور پھر یہ ایک ایسی صنف ہے جس میں خودکشائی کے عمل سے گزرنا ہوتا ہے اور خواتین کا اپنے بارے میں عام طور پر اتنی تفصیل بیان کرنا،ایسے ماحول میں جہاں اسے چار دیواروں میں قید رکھا گیا ہو،نہایت مشکل تھا۔اسی لئے ابتداً چنندہ خواتین نے ہی اس جانب اقدام کیا۔لیکن بعد میں قابل قدر اور بہترین خودنوشتوں سے اردوادب جگمگانے لگا۔جن میں نواب سلطان جہاں بیگم کی ”تزک سلطانی“،وملا کماری کی ”ایک ایکٹریس کی آپ بیتی“،اداجعفری کی ”جو رہی سو بےخبری رہی“،امریتا پریتم کی ”رسیدی ٹکٹ“،نفیس بانوشمع کی ”جنت سے نکالی ہوئی حوا“،کشور ناہید کی ”بری عورت کی کتھا“،صالحہ عابد حسین کی ”سلسلہ روز وشب“اور بیگم انیس قدوائی کی آپ بیتی ”آزادی کی چھاؤں میں“وغیرہ کو بہت مقبولیت اور شہرت ملی۔

”آزادی کی چھاؤں میں“مکمل خودنوشت نہیں یعنی اس میں مصنفہ کے حالات زندگی نہیں بلکہ قلبی واردات کا بیان ہے۔بیگم انیس قدوائی کے شوہر اپنی ڈیوٹی کے دوران تقسیم ہند فسادات کا شکار ہو گئے تھے۔ظاہر ہے یہ صدمہ ان کی بیگم کے لئے بہت دردناک تھا لیکن اس سے بھی زیادہ تکلیف انھیں ہندوستان کے بکھر جانے اور یہاں کے سیکولر باشندوں کے ٹوٹ کے جانے کی تھی۔انھوں نے اپنی اس کتاب کے ذریعہ انہی شکستہ دلوں کو تقویت اور ہمت فراہم کرنے کی کوشش کی ہے۔وہ آنے والی نسلوں کو خبردار بھی کرنا چاہتی ہیں اور آمادہ بھی کے حالات چاہے جیسے ہوں اپنے وطن کی محبت اور اس سے وفاداری کا درس ہمیشہ یاد رکھنا چاہئے۔وہ ایک جگہ لکھتی ہیں۔

> سارا بوجھ نئی نسلوں کے کاندھوں پر پڑنے لگا۔اس سے پہلے کہ وہ اس بوجھ کو اٹھائیں یہ کتاب ان کے ہاتھوں میں پہونچ جانا چاہئے تاکہ وہ ہوا کا جھونکا اور رخ دیکھ کر ہی اپنی کشتی دریا میں ڈالیں۔انھیں پتہ لگ جائے کہ کہاں چٹانیں حائل ہیں اور کہاں بھنورتا کہ ان کی ناؤ بھی عین منجدھار میں پھنس کر ہماری طرح تباہ نہ ہو جائے۔(۳۰)

اس بات سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا کہ فنی اعتبار سے یہ کتاب خودنوشت میں داخل نہیں ہوگی لیکن ایک عہد کی سچی داستان تاریخی حوالوں سے اپنے اندر ضرور سموئے ہوئے ہے۔

بیسویں صدی میں اردو خودنوشت نگاری میں فن، تعداد اور قاری دونوں اعتبار سے غیر معمولی نتائج

سامنے آئے۔ادب کے شائقین اب نہ صرف اپنے مذاق کے اعتبار سے ادب کا مطالعہ کرتے بلکہ اپنے پسندیدہ ادیب کے حالات زندگی جاننے میں بھی دلچسپی لیتے۔اس اشتیاق اور تقاضوں نے ادبا کو اپنے حالات زندگی قلمبند کرنے کی طرف مزید متوجہ کر دیا۔اکیسویں صدی کے آغاز میں ہی ایک بہت اچھی خودنوشت سامنے آئی جس نے یونیورسٹی ماحول کی نمائندگی کی۔ یہ کتاب آل احمد سرور نے "خواب باقی ہیں" نام سے ترتیب دی۔ جوسن 2000 میں شائع ہوئی۔

اس کتاب میں بیسویں صدی کے نصف آخر کا لکھنؤ،علی گڑھ ، اور کشمیر وغیرہ اور اس زمانے کی اہم شخصیتیں،مخصوص عہد کے رجحانات ، سیاسی داؤ پیچ ، ادب،تہذیب ، ادبی مراکز اور انسانی مزاج کے بارے میں نہایت عمدہ طریقہ سے گفتگو کی گئی ہے۔خلیق انجم اس کتاب میں بارے میں لکھتے ہیں

> سرور صاحب نے صرف کتابوں ہی سے علم حاصل نہیں کیا بلکہ مشاہدوں،تجربوں اور احساس کی آنکھوں سے بھی زندگی کو دیکھا اور پرکھا ہے یہ کتاب احوالِ واقعی کا بیان ہے۔سرور صاحب نے پچھلے ساٹھ پینسٹھ(۶۰،۶۵) سال کے بدایوں، الہ آباد،میرٹھ،پیلی بھیت ،سیتاپور،بجنور،گونڈا،آگرہ، غازی پور،علی گڑھ،شملہ اور کشمیر کے سماجی ، سیاسی اور ادبی حالات بیان کئے ہیں۔ یہ حالات مختصر ہیں اور بعض اوقات صرف چند فقروں پر مشتمل ہیں لیکن بصارت اور بصیرت کا بہترین نمونہ ہیں۔(۳۱)

پروفیسر آل احمد سرور نے مختلف یونیورسٹیز میں درس وتدریس کے فرائض انجام دئے اسی لئے ان کی خودنوشت میں تعلیمی نظام،شعبہ کے اندرونی معالات،اور اساتذہ کی تقرریوں کے بارے میں بہت کچھ معلومات دستیاب ہے۔اردو خودنوشت میں اس کتاب کو کافی اہمیت حاصل ہے۔

اس کے بعد 2004 میں پرویز ملک زادہ منظور کی رقص شرر نے خودنوشت کی جمالیات میں اضافہ کیا وہیں 2006 میں سید وارث کرمانی کی "گھومتی ندی" نے خودونوشت کے سیل رواں میں بہاؤ کو اور تیز کر دیا۔ پھر ماہرلسانیات مسعود حسین خان کی خودنوشت "ورود مسعود"،مقبول فکشن نگار رتن سنگھ کی سرگزشت "بیتے ہوئے دن" اور عابد سہیل کی داستان حیات "جو یاد رہا" نے اس نئی صدی کے آغاز میں ہی اردو خودنوشت کو قیمتی سرمایہ فراہم کیا۔

"جو د یاد رہا"ایک ضخیم آپ بیتی ہے۔جس میں ایک افسانہ نگار،تنقیدنگار،صحافی،مترجم اور محنت کش انسان اپنے واردات قلبی اور حادثات زندگی کو بیان کرتا ہے۔ یہ کتاب تقریباً نصف صدی سے زائد کی تاریخ کو

اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ مصنف کی صدق گوئی اور ہمدردانہ رویہ جا بجا نظر آتا ہے۔ اکثر مقامات پر حیرت بھی ہوتی ہے کہ کوئی شخص اس قدر انسان دوست بھی ہوسکتا ہے کہ اپنے ساتھی کے مرجانے پر اس کے نام "سہیل" کو اپنے نام کے ساتھ ہمیشہ کے لئے وابستہ کرلے۔ لیکن اس بات سے انکار بھی ممکن نہیں کہ تقریباً 700 صفحات کی اس کتاب میں بہت سے واقعات اور مشمولات غیر ضروری محسوس ہوتے ہیں جن کے بغیر بھی یہ حیات نامہ مکمل معلوم ہوتا ہے، جس کا بیان آئندہ باب میں کیا جائے گا۔

سال 2021 میں شائع ہونے والی خودنوشت "نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم" پروفیسر شارب ردولوی کی ہے۔ شارب ردولوی کا تعلق مجاز کے وطن ردولی سے ہے جو اپنے تہذیبی ورثے کے لئے اودھ بلکہ پورے ہندوستان میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ شارب ردولوی نے اپنا بچپن اور لڑکپن کانپور اور لکھنؤ میں گذارا اور جوانی کے آغاز کے ساتھ ملازمت کی غرض سے دہلی پہنچ گئے جہاں سے ایک عرصہ طویل کے بعد لکھنؤ واپس آئے اور یہاں اپنے کالج شعاع فاطمہ گرلس انٹر کالج کی بنیاد ڈالی جو آج بھی علم کی شمع روشن کئے ہے۔

اس کتاب میں مصنف نے اپنے شجرہ نسب کا تفصیل سے بیان کیا ہے۔ ان کے مورث اعلیٰ جنہیں قاضیان سلطانپور کے نام سے جانا جاتا تھا 1193 میں بلخ سے ہندوستان منتقل ہوئے تھے۔ یہ ہجرت عالم وصوفی علی بلند دستار نے کی تھی۔ ان کی اولادوں میں جو بزرگ گزرے ان کو بادشاہ وقت نے قاضی القضاۃ کے عہدہ پر مقرر کیا۔ زمانہ کی گردشوں اور حالات کے تقاضوں نے انھیں ردولی منتقل ہونے پر مجبور کردیا جہاں صاحب کتاب نے آنکھ کھولی۔

کتاب کا یہ ابتدائی حصہ اس حوالے سے بہت اہم کہ مختصر سے وقت میں کئی صدیوں کی تاریخ کا خاکہ ذہن میں کھنچ جاتا ہے اور کتاب کے ارتقائی مرحلے کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی بدلتی تہذیب اور ثقافت کو سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔ یہ کتاب نہایت جامع انداز میں لکھی گئی ہے جس میں ادبی مسائل، تہذیبی قدریں، فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور تنہا شخص کی محنت، مشقت اور کاوشوں کا ذکر ہے۔ ایک حصہ لکھنؤ کے موجودہ منظرمہ کے حوالے سے بھی ہے جس میں یہاں کی بزرگ وجوان شخصیتوں کے بارے میں معلومات فراہم کی گئی ہے۔ جس میں اودھ نامہ کے بانی سید وقار رضوی کو ایک فعال کردار بنا کر پیش کیا گیا ہے یہ حصہ وقار رضوی کی پوشیدہ انتظامی صلاحیتوں کو قاری کے سامنے لاتا ہے۔ وقار رضوی اور مصنفِ کتاب فکری وطبعی دونوں اعتبار سے نہایت قریب تھے اسی لئے ان کی وفات کو مصنف نے اپنے لئے ایک ذاتی صدمہ قرار دیا۔ کتاب میں وقار رضوی کی خدمات کے اعتراف نے صاحب کتاب سے ان کی محبت کو بھی نمایاں کردیا ہے۔ وقار رضوی سے ان کی کب ملاقات ہوئی اور وہ کس طرح

اتنے قریب ہو گئے یہ ساری باتیں اتنی فطری انداز میں بیان کی گئی ہیں کہ قاری خود اس رشتہ میں جڑنے کا خواہشمند نظر آتا ہے۔

اردو خودنوشت کا یہ سفر جاری ہے اور لکھنے والے اپنی سرگزشت قلمبند کر رہے ہیں۔ اردو خودنوشت کا یہ سفر آغاز سے تا ایں دم کہیں بھی کمزور نہیں پڑا، حیات نامہ کم ضرور شائع ہوئے لیکن ان کی اشاعت رکی نہیں جو عوام میں اس کی مقبولیت کا واضح ثبوت پیش کرتی ہے۔

☆عابد سہیل کی خودنوشت "جو یادرہا" کا تنقیدی مطالعہ

"جو یادرہا" عابد سہیل کی ان یادوں کا گلدستہ ہے جو زمانے کے امتداد کے ساتھ مزید شگفتہ نظر آرہا ہے۔جس میں انھوں نے شب وروز کے واقعات اور صبح وشام کے حادثات کو صدق دلی سے بیان کردیا۔نہ اپنی ناکامیوں کو چھپایا اور نہ ہی کامرانیوں کو بڑھایا۔بشمول تصاویر کے یہ کتاب 712 صفحات میں ایک عہد کی تاریخ، تہذیب، سیاست، رواداری اور عادات واطوار کی دنیا آباد کئے ہوئے ہے اسی لئے اس کتاب کو عابد سہیل کی ایک بہترین اختراعی کاوش سمجھا جاسکتا ہے۔

کتاب کا آغاز "زندگی، خوشی، معنویت" عنوان کے ساتھ ہوتا ہے۔یہ ایک غور طلب اور فکر وسوچ کو جلا بخشنے والا مضمون ہے جس کے تحت عابد سہیل نے تمہیداً کچھ باتیں لکھی ہیں۔جس میں خوشی کیا ہے! کا فلسفیانہ ذکر ہے جس میں وہ پہلے خوشی کے موضوع پر اظہار خیال کرتے ہیں اور اس ضمن میں ملک کے پہلے وزیراعظم پنڈت نہرو کی تقریر کا ایک جملہ ذکر کرتے ہیں جس کا مفہوم ہے کہ "خوشی کوئی پسندیدہ ذہنی کیفیت نہیں" ساتھ ہی ذاکر حسین کا ایک قول بھی نقل کیا ہے جس میں زندگی کے جینے کا ذکر ہے۔جملہ کچھ اس طرح ہے

"آدمی جب شدت سے زندہ رہتا ہے زیادہ دن نہیں چلتا" (۳۲)

پھر فن صحافت پر روشنی ڈالتے ہیں اور کھلر صاحب کے سوالناموں کا ذکر ہے جو صحافت کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کررہے تھے۔یہ 1975 کا زمانہ ہے۔اس گفتگو کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں تمام سوالات روایتی تھے لیکن ایک سوال عابد سہیل نے خود اپنی طرف سے قائم کیا تھا اور یہ ایک نیا زاویۂ نظر تھا صحافت سے جڑے لوگوں کو بحیثیت انسان سمجھنے کے لئے۔عابد سہیل کے مطابق ایک صحافی انسانی زیاں پر مشتمل حادثات سنتے سنتے اس منزل پر پہنچ جاتا ہے جہاں اس کا دل سفاک اور بے رحم بن جاتا ہے جس کا نتیجہ مصنف کے الفاظ میں ملاحظہ ہو

> "صحافی اگر کسی گہرے عشق کے تجربے سے نہ گذرے، اس کی کوئی ہابی (Hobby) نہ ہو، فنونِ لطیفہ سے لطف اندوز نہ ہوتا ہو، چڑیوں کی چہچہاہٹ اس کے دل کی کلی نہ کھلا دیتی ہو، خاموشی سے بہتی ہوئی ہوا میں دھیرے دھیرے ڈولتے ہوئے پھول پر نظر پڑنے کے بعد وہ پلٹ پلٹ کر اسے دیکھنے پر خود کو مجبور نہ پاتا ہو تو بالکل ممکن ہے کہ وہ اپنے پیشے کی بلندیوں کو چھو لے لیکن اسے اس کی قیمت بھی چکانی پڑے گی۔۔۔اپنے دل کے سفاک اور بے رحم بن

جانے کی شکل میں" (۳۳)

یہ اقتباس عابد سہیل کی خودنوشت پڑھنے والے کو تذبذب میں ڈال دیتا ہے کیوں کہ عابد سہیل ایک سینئر صحافی تھے اور ساتھ ہی ہمدرد اور حساس طبع انسان بھی۔ مذکورہ بالا اقتباس کے مطابق دو متضاد چیزیں ان کی شخصیت میں نمایاں تھیں۔ اس کی وجہ صرف یہی ہوسکتی ہے کہ انھوں نے صحافت کی "سخت مزاجی" سے بچنے کے لئے ادب کی "لطیف ڈھال" کو ہمیشہ اپنے ساتھ رکھا۔ اس طرح طبیعت کے توازن نے انھیں ایک صحافی بھی معتبر بنایا اور انسان بھی ہمدرد۔

کھلر صاحب بھی ایک اخبار سے وابستہ ہو گئے اور ان کے چہرے پر چمک آ گئی جو بینک بیلنس کے بعد نمایاں ہوتی ہے۔ ڈپٹی نیوز ایڈیٹر بننے کے بعد بقول مصنف ان کے لہجے میں خاصی رعونت تھی، خاصا غرور تھا۔ میاں بیوی کی مجموعی آمدنی ٹھاٹ باٹ سے زندگی گذارنے کے لئے کافی تھی اسی لئے وہ نئی اسکوٹر پر سوار بے فکر و بے پرواہ زندگی کا سفر کرتے رہے۔

یہاں تک پہنچنے کے بعد عابد سہیل نے اصل مقصد کو بیان کیا ہے اور وہ لکھتے ہیں

> "سطحی خوشیوں سے کیسی بھرپور، آسودہ اور ہر قسم کے تفکر سے عاری زندگی جی رہے ہیں ہمارے کھلر صاحب۔ تکیے پر سر رکھتے ہی نیند کی گود میں پہنچ جانے والی دو آنکھیں انھوں نے ناک کے اوپر دائیں بائیں جانب کی کٹوریوں میں جڑ لی ہیں۔۔۔ کیا اس طرح کی زندگی میں کسی قسم کی معنویت اور اسکی پروردہ اعلیٰ اور ارفع خوشی کی تلاش کی جاسکتی ہے؟" (۳۴)

مصنف کے نزدیک تلاش حیات حصول انبساط کا نام نہیں جو صرف مال و دولت ہی کے ذریعہ ممکن ہو، بلکہ زندگی تو مسلسل جد و جہد ہے جہاں آرام صرف لمحہ بھر کا ہے۔ اگر اپنی پریشانیاں ختم ہو گئیں تو دوسروں کی مصیبتوں پر بے چین ہونا، خود کامیاب ہو گئے تو غیروں کی کامرانیوں کے لئے سرگرداں رہنا اور اگر خالق حیات نے اتنا نواز دیا کہ اب کوئی خواہش ہی باقی نہ رہی تو خواہشمندوں کی طلب کو اپنی آرزومندی سمجھنا ہی اصل زندگی ہے۔

بظاہر خودنوشت کے آغاز میں خوشی و زندگی کے بارے میں پنڈت نہرو اور ذاکر حسین کے اقوال اور کھلر صاحب کے سوالناموں کا ذکر ایک منتشر گفتگو معلوم ہوتی ہے مگر اس میں ایک منطقی اور فلسفی ربط ہے جسے عابد سہیل نے آخر کی چند سطروں میں نہایت خوبصورتی سے بیان کر دیا وہ لکھتے ہیں:

"عام معیاروں کے مطابق کھلر صاحب کی زندگی آسودگی سے چھلکتی ہوئی بے حد مطمئن ہے۔۔۔خوشی کو بہت پسندیدہ ذہنی کیفیت قرار دینے سے احتراز کرتے ہوئے شاید معنی سے عاری ایسی ہی خوشی پنڈت نہرو کے پیش نظر رہی ہوگی اور غالباً انھیں معنوں میں بس زندہ رہنے کے مقابلے میں "شدّت" سے جینے کا نازک فرق ذاکر صاحب پر منکشف ہوا ہوگا۔

شادکامی بس یہ ہے کہ ایسی بے تعقل اور معنویت سے عاری زندگی اور بے محابا خوشی سے خدا نے مجھے محروم رکھا ہے۔

یہ ہے وہ ذہنی پس منظر جس میں شعور کی آنکھیں کھولنے کے بعد سے اب تک کی زندگی بسر کی ہے۔"(۳۵)

کتاب کی دلچسپ، منطقی اور فلسفیانہ یہ تمہید قاری کو خودنوشت میں مصنف کا ہمسفر بنانے کے لئے سودمند ثابت ہوتی ہے کیونکہ یہاں مصنف نے اپنی حیات کی وہ رمق نمایاں کر دی جو قاری کو مصنف کی پوری زندگی سمجھنے میں سہارا دے گی۔

اس تمہید کے بعد مصنف نے "اب کچھ جو یاد رہا کے بارے میں" کا عنوان قائم کیا ہے۔اس عنوان کے تحت عابد سہیل نے کتاب کی ترتیب کی صورتحال اور خودنوشت نگاری کے چند نازک نکات کی طرف اشارے کئے ہیں۔اس تحریر سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کا خاصہ حصہ 2003 اور اس سے کچھ پہلے ہی لکھا جا چکا تھا پھر مصروفیتوں نے اسے مکمل نہیں ہونے دیا آخر کار اردو اکادمی دہلی نے عابد سہیل کو اسکالرشپ دے کر اپنی خودنوشت مکمل کرنے کی درخواست کی اور اس طرح 2012 میں عابد سہیل کو جو کچھ یاد تھا اس نے "جو یاد رہا" کی شکل اختیار کر لی۔اس تحریر کے آخری اقتباس میں لکھتے ہیں

"دہلی اردو اکادمی اور میرے پیارے دوست قمر رئیس نے یہ کام میرے سپرد کر کے مجھے تقریباً ساری زندگی ایک بار پھر سے جینے کا موقع دیا۔"(۳۶)

عابد سہیل نے "جو یاد رہا" میں خودنوشت کے فن پر بھی کچھ باتیں تحریر کی ہیں اور آپ بیتی لکھنے میں پیش آنے والے چیلنجز کا ذکر کیا ہے۔

☆خودنوشت نگاری اور عابد سہیل

خودنوشت نگاری کے تعلق سے اپنی رائے قائم کرنے والے تمام ماہرین اس فن کو نہایت مشکل تصور کرتے ہیں۔ظاہر ہے کہ کامیابیوں کے بیان میں مہارت دکھانا آسان ہے لیکن لغزشوں کو صدق دلی کے ساتھ کہہ ڈالنا ہر کس و نا کس کے بس کی بات نہیں اور پھر دلسوزی اور احترامات کی پاسداری کے ساتھ توازن برقرار رکھنا ایک مہم ہے جسے سر کرنے والا ہی "سکندر" کہلاتا ہے۔

عابد سہیل بیشک "سکندر" ہی تھے جنھوں نے اس معرکہ آرائی میں ظفرمندی کے پرچم کو سربلند رکھا۔ وہ قلم اٹھانے سے پہلے ہی اس بات سے خبردار تھے۔انھوں نے چند لفظوں میں اس طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا

> "خودنوشت لکھنا خود کو آزمائش میں ڈالنا ہے کہ نفس کبھی کبھی ان عظمتوں اور رفعتوں کا مطالبہ کرتا ہے جن کا دور دور تک وجود نہیں ہوتا اور ضمیر راہ راست سے ذرا سے انحراف پر سرزنش۔ڈھڑکا یہ بھی لگا رہتا ہے کہ اس کشمکش میں نہ جانے کسے، کب کہاں اور کس قدر بالادستی حاصل ہو جائے۔۔۔
>
> اور یہ بھی ہوتا ہے کہ سازی زندگی کی دوستیاں، دشمنیاں، کمزوریاں، کوتاہیاں اور کمینگیاں دستک دیتی ہیں اور وقت کا عنصر ان کی صحیح ترجمانی کی راہ میں مشکلیں کھڑی کر دیتا ہے تو ترازو کا پلڑا اپنی طرف جھکنے لگتا ہے۔یہ ایک بھیانک جنگ ہوتی ہے؛ اپنے آپ سے لڑنا کوئی آسان کام نہیں۔" (۳۷)

عابد سہیل نے اپنی آپ بیتی کی ترتیب میں توازن کا بیحد خیال رکھا ہے اور بہت سی باتیں جن کا بیان اتنا ضروری نہیں تھا شعوری طور پر ترک کر دیں یا پھر واقعات بیان کرنے میں نام تبدیل کر دئے ہیں۔آخر میں محمد مسعود (جنھوں نے مسودے کو توجہ سے دیکھا) کے شکریہ اور منکسرانہ اعترافات کے بعد فیصلہ قارئین کی صوابدید پر چھوڑ دیا۔

☆☆☆

"جو یاد رہا" تہذیب، تاریخ، تجربات، سیاست، صحافت، محبت، ادب، احترام، فریب خوری اور ناقابل فراموش واقعات پر مشتمل کتاب ہے۔ان اوراق میں ایک ایسے شخص کی کہانی ہے جسے قدم قدم پر زندگی نے کوئی نہ کوئی سبق ضرور دیا خواہ وہ اس کی اچھائی کی وجہ سے ہو یا پھر کوتاہی کی بنا پر۔اسی لئے یہ کتاب مزید

دلچسپ بن جاتی ہے۔ یہاں اس بات کا اعتراف بھی ضروری ہے کہ بہت سے ایسے واقعات بھی درج ہیں جن کی غیر ضروری طوالت قاری کو گراں معلوم ہوتی یا پھر چند ایسے ذکر جن کا کتاب یا صاحب کتاب سے کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔ مثلاً صفحہ 352 پر "پارکنسن لا" عنوان کے تحت ایک صفحہ کی تحریر ہے جس میں پارکنسن کے بنائے ہوئے اصولوں کی بات کی گئی ہے۔ یہ ذکر عابد سہیل نے صحافت کے ادارتی عملے، ملازمین اور ان کی ملازمت کے تعلق سے درج کیا ہے حالانکہ یہاں پر اس کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ اس کی قرات کے بعد یا دیگر ایسے طویل موضوع کو پڑھنے کے بعد کتاب پر خودنوشت کے بجائے کسی مضمون کے مجموعہ کا گمان ہونے لگتا ہے جو فنی تقاضوں پر کہیں کہیں پورا نہیں اترتا اور خودنوشت کے فن کو مجروح کرتا ہے۔

بنیادی طور پر قاری سوانح حیات سے تین چیزوں کا متقاضی ہوتا ہے۔ مصنف کی شخصیت کا انکشاف، اس کے عہد کی تصویر اور ادبیت۔ اس کے علاوہ جو چیزیں ہیں وہ ان ہی عناصر کے ضمن میں آتی ہیں مثلاً صداقت جس کا تعلق واقعات بیانی سے ہے چاہے وہ خود سے وابستہ ہوں یا دوسروں سے۔ یا پھر تہذیب وثقافت، ادب واحترام وغیرہ کا ذکر، یہ گفتگو "عہد کی تصویر" کے تحت آئیں گی کہ مصنف جس سماج یا زمین سے جڑا تھا وہاں کے عادات واطوار اور رسم ورواج کیا تھے وغیرہ وغیرہ۔ اور ادبیت میں وہ تمام فنی لوازمات آجائیں گے جس کا تعلق زبان وبیان سے ہے۔ یعنی مصنف نے انداز اظہار کیسا اختیار کیا ہے، تشبیہ، استعارات، محاوارات اور زبان کی نوعیت کیا ہے وغیرہ وغیرہ۔

"جو یاد رہا" بھی ان مطالبہ بندی سے آزاد نہیں ہے۔ قاری سب سے پہلے اس کتاب میں عابد سہیل کی شخصیت کو ڈھونڈتا تھا۔ مصنف کے بچپن، جوانی اور اس کے بعد کے مراحل کو جاننے کا اشتیاق اسے کتاب کے گوشہ گوشہ تک لے جاتا ہے۔ عابد سہیل نے اس مقام پر قاری کو مایوس نہیں کیا۔ انھوں نے پڑھنے والے کی ملاقات "عابد سہیل" سے پہلے "محمد عابد" سے کرائی۔ پھر "محمد عابد" سے "عابد سہیل" تک کے سفر میں قاری کو اپنا ہمراہ بنا لیا۔

عابد سہیل نے خودنوشت میں اپنی کہانی کا آغاز اولین یادوں کے عنوان سے کیا ہے۔ یہاں مصنف کا انداز نہایت دلچسپ ہے وہ ایک گیند (جسے انگریزی میں Crazy Ball کہا جاتا ہے) کا ذکر کرتے ہیں جو زمین پر پٹخنے سے خوب اچھلتی ہے۔ ایک دن کھیل کھیل میں یہ گیند کھو جاتی ہے اور عابد سہیل کے لاکھ لاکھ ڈھونڈھنے کے بعد نہیں ملتی۔ یہ ادبی سے پُر سطریں اور محرومی کا بیان خودنوشت نگار کی زندگی کا نچوڑ ہے جہاں خوشی بھی بس چند لمحوں کی تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہوگئی۔ اس انداز بیان پر ڈاکٹر صبیحہ انور نے لکھا ہے

"ہاں، یہ بات کتاب کی مکمل خواندگی کے بعد ہی سمجھ میں آئی کہ بالکل ابتدا میں خوشی کی معنویت پر اتنی تفصیل سے بحث کیوں کی گئی ہے اور اپنی اوّلین یادوں میں درخت کے گوند سے مہینوں کی محنت سے تیار کی گئی اس بدشکل گیند سے ایسا والہانہ تعلق کیوں ہے کہ ستر پچھتّر سال بعد بھی اس کی یاد کچوکے لگاتی ہے۔ سیاہ بدشکل گیند کا راحت اور طمانیت کی جھلک دکھا کر نظروں سے اوجھل ہوجانا دراصل خوشی اور کیف کے وقتی اور بے ثبات ہونے اور زندگی میں ہجر، اضطراب اور دُکھ کے دائمی ہونے کا اشاریہ ہے۔"

عابد سہیل نے اورئی کے اپنے پرانے مکان میں آنکھ کھولی تھی اور چند برس بعد ہی نئے مکان میں منتقل ہو گئے تھے یہاں بھی وہ زیادہ عرصہ تک نہیں رہے لیکن یہاں کی ایک ایک بات ان کو یاد ہے بقول مصنف

"میں نے اس مکان میں اپنی زندگی کے تقریباً پانچ سال گذارے۔ یہ وہ عمر تھی جس میں ایک نظر دیکھنے سے چیزیں حافظے میں گھر بنا لیتی ہیں۔ اس مکان کا ایک ایک کمرہ، ایک ایک دالان، دو بڑی بڑی چھتیں، ان کے پیچھے کے لمبے لمبے کمرے، حد یہ ہے کہ اوپر کا غسل خانہ تک دل و دماغ میں اس طرح بسا ہوا ہے کہ آنکھ بند کر کے اس کا نقشہ بنا سکتا ہوں۔" (۳۹)

عابد سہیل اپنے اس دعویٰ میں سچے نظر آتے ہیں کیونکہ انھوں نے صرف مکان کے در و دیوار کا نقشہ ہی نہیں کھینچا بلکہ اس لمحے کی بھی تصویر کشی کر دی جب ان کے والد گھر خریدنے سے قبل مولوی صاحب کو اس مکان کے معائنہ کے لئے جاتے ہیں۔ مولوی صاحب پورا مکان دیکھتے ہیں اور گھر میں بنے دو طاق کے اوپری حصے کو ناخن سے کھرچتے ہیں اور وہ جگہ سیاہ نکلنے پر یہ خبر دیتے ہیں کہ یہاں دفینہ ہے۔ اگر خود سے ظاہر ہو جائے تو ٹھیک ہے ورنہ اس کو حاصل کرنے کی کوشش نہ کیجئے گا ورنہ اس کی بھاری قیمت چکانی پڑ سکتی ہے۔ عابد سہیل کے مطابق یہ کہتے ہوئے انھوں نے ان کی طرف دیکھا تھا۔ مصنف کا یہ اشارہ تھا پرانے زمانے میں کہی جانے والی بات کی طرف جہاں دفینہ حاصل کرنے کے لئے اپنی اولاد کی قربانی پیش کرنا ہوتی ہے حالانکہ یہ حقیقت سے بہت دور ہے۔ عابد سہیل کے والد بھی ان سب باتوں پر یقین نہیں رکھتے تھے کیونکہ اس سے قبل کے صفحات میں چور کا پتہ لگانے کے لئے کسی ملانی جی کا ذکر آیا ہے کہ وہ اپنے تشتری، کیل اور پرانی چپل کے ایک عمل سے چور کا پتہ لگا لیتی ہیں۔ یہ

سب باتیں سننے کے بعد عابد سہیل کے والد مزاحاً کہتے ہیں

"رنجیت صاحب (پولیس کے اعلیٰ افسر) کو ان کا نام پتا بتادوں گا۔ ملانی جی ان کے بہت کام کی ثابت ہوں گی۔"(۴۰)

عابد سہیل نے اس مکان میں 4 سے پانچ سال کا عرصہ گذارا اور پھر 1940 میں وہ بھوپال چلے گئے۔ آبائی وطن اورئی کو قلیل مدت میں ہی الوداع کہہ دیا لیکن یہاں کی یادوں کا بسیرا ہمیشہ ان کے ساتھ رہا۔
بھوپال بھیجنے کا مقصد ان کی اچھی پرورش تھا کیونکہ اورئی میں نہ تو اچھی تعلیم کا کوئی انتظام تھا اور نہ ہی وہ تہذیب وادب جو ان کے گھر میں رائج تھا۔ عابد سہیل کے گھر میں وہ زبان بھی استعمال نہیں ہوتی تھی جو عمومی طور پر گاؤں میں بولی جاتی تھی۔ گھر کے تمام افراد تعلیم یافتہ تھے اس لئے گھر کا ماحول مکمل طور پر خصوصاً زبان کے معاملہ میں نہایت شائستہ اور نفیس تھا۔ لیکن ان سب کے باوجود ایک لڑک پن کی طبیعت کو گھر کی چار دیواری میں قید نہیں رکھا جاسکتا ہے۔ یہ دور بچوں کی نشونما کا ہوتا ہے جو کھلی فضا میں سانس لینا چاہتے ہیں۔ یہی کھلی فضا ان کی طبیعت اور مزاج کو رخ دیتی ہے۔ ایک بہتر ماحول کے لئے ہی عابد سہیل کو بھوپال منتقل کیا گیا تھا تا کہ وہ اچھی تعلیم کے ساتھ ساتھ خوشگوار فضا سے فائدہ اٹھا سکیں۔ مصنف کے یہ جملے اس بات کی طرف اشارہ بھی کرتے ہیں

"ایک دن میرے منہ سے تین چار ایسے الفاظ نکل گئے، اور وہ بھی مختصر سی گفتگو میں، جو ہمارے یہاں استعمال نہیں ہوتے تھے۔ والد کے کان کھڑے ہوئے، تشویش ان کے چہرے سے عیاں تھی۔ رات میں ابّا اور امّا میں اس مسئلہ پر باتیں ہوتی رہی لیکن اسی دوران مجھے نیند آ گئی۔

بعد میں معلوم ہوا کہ مجھے بھوپال بھیجا جا رہا ہے"(۴۱)

بھوپال سے عابد سہیل کی ذہنیت سازی اور مزاج کی پختگی کا دور شروع ہوتا ہے۔ یہاں انھیں اپنے ہم عمر کا ساتھ ملا اور پھوپی کے پیار کے ساتھ ساتھ پھوپا کی سرپرستی حاصل ہوئی۔ ان کی شخصیت پر ایک نئے ماحول کا اخذ وقبول شروع ہو گیا تھا۔ بقول مصنف

"یہاں کی زندگی مختلف تھی لیکن نہ صرف زندگی ہی مختلف تھی میں بھی ہر دن کم سے کم دو دن بھر روز تبدیل ہو رہا تھا۔"(۴۲)

عابد سہیل نے بھوپال کے ذکر میں بڑی حد تک صداقت سے کام لیا۔ اپنی شرارتوں کو بھی بیان کیا اور

ان پر پڑنے والی مار کو بھی۔اس حصہ میں درس اور واقعات کے وہ نشانات بھی نصب ہیں جو مصنف کی طبیعت سازی اور شخصیت کی تعمیر میں اولیت کا درجہ رکھتے ہیں۔مصنف نے بھوپال میں اپنی شرارتوں کا آغاز کیا تو حشمت پھوپا نے کچھ مروت کے بعد ان کی پٹائی کا۔نہ عابد سہیل نے شراتیں چھوڑیں اور نہ حشمت پھوپا نے ان کی پٹائی۔لیکن اس سب کے بیچ ان کو درس ایسے ملے جو اتنے سال بعد خود نوشت لکھتے وقت بھی ذہن سے محو نہیں ہوئے۔

کچھ زمانے بعد عابد سہیل کا داخلہ بھی ایک اسکول میں کرا دیا گیا۔ایک دن وہاں جاتے میں انھیں زمین پر پڑا پتھر پسند آ گیا جسے وہ روزانہ پابندی سے ٹھوکر مارتے ہوئے اسکول لے جاتے اور پھر واپس لاتے۔اس مشقت سے ان کے جوتے تاب نہ لا سکے اور یکے بعد دیگرے دم توڑنے لگے۔جب پھوپا کو اس بات کا علم ہوا تو انھوں نے عابد سہیل کو بلایا۔اپنی شامت کے خوف سے عابد سہیل تھر تھر کانپ رہے تھے مگر پھوپا نے ان کو مارنے کے بجائے سمجھانا شروع کیا۔یہ گفتگو عابد سہیل کے دل پر اس طرح لگی کہ وہ اسے بھول نہیں پائے۔ گفتگو تھی بھی بہت پر لطف اور معنی خیز،اس کا اندازہ اس جملہ سے لگایئے جو عابد سہیل کے پھوپا آخر میں کہتے ہیں

> ”جسے چاہو، جس سے پیار کرو، اسے ٹھوکریں لگاؤ، کتنی بری بات ہے!“۔۔۔سڑک پر کوئی پتھر دیکھو تو اسے اٹھا کر کنارے کر دیا کرو۔“(۴۳)

یہ الفاظ عابد سہیل نے اس وقت سنے جب ان کی عمر بچپن کی آغوش سے نکل کر جوانی کے کاندھوں پر سوار ہو رہی تھی۔اس عمر میں ذہن کے رجحانات پختہ ہوتے ہیں اور طبیعت کے میلانات نکھرتے ہیں۔یہی سبب تھا کہ عابد سہیل کے مزاج پر ان جملوں نے بہت گہرا اثر ڈالا اور بقول ان کے

> ”پھوپا جان کی اس دن کی باتوں میں جانے کیا جادو تھا کہ سڑک پر پڑے ہوئے پتھروں کو کنارے کر دینے کی ایسی عادت پڑ گئی کہ اب تک اس نے ساتھ نہیں چھوڑا ہے اور یہ انھیں کا فیض ہے کہ اب تک، اپنے ہوش و حواس میں، کسی کی راہ کھوٹی نہیں کی۔“(۴۴)

یہ سوال ذہن میں اٹھتا ہے کہ ترقی پسند اور کمیونسٹ پارٹی کے فعال رکن عابد سہیل اپنے بچپن میں کس طرح تھے کیونکہ ان کے گھر کا ماحول خاص طور سے ننھیال کا ماحول مذہبی تھا۔وہاں دینی کتب بینی کا شوق ہر کسی کو تھا یہ دور وہ تھا جہاں پردہ کا اہتمام اس قدر تھا کہ ڈولی میں عورت کے ساتھ کچھ پتھر بھی رکھ دئے جاتے تھے تا کہ کہار کو خاتون کے وزن اندازہ نہ ہو۔بھوپال میں پھوپا بھی مذہبی تھے اور کچھ لوگ انھیں مولوی صاحب بھی کہتے تھے۔ عابد سہیل نے اپنی شخصیت کے اس پہلو کو بھی تشنہ نہیں رکھا جو کافی ضروری بھی تھا۔انھوں نے لکھا ہے کہ بھوپال کے

زمانے میں وہ کافی مذہبی تھے اتنے کہ پانچوں وقت کی نماز کے ساتھ ساتھ تلاوت قرآن کا بھی اہتمام کرتے تھے۔ انھوں نے پہلا روزہ بھی بھوپال ہی میں رکھا تھا اس موقع پر روزہ کشائی کی رسم بھی ادا کی گئ تھی۔ اس بیان میں عابد سہیل نے اپنے ذہن کی تمام یادوں کو بلاکم وکاست پیش کر دیا ہے یہاں تک کہ یہ بھی بتا دیا کہ انھوں نے پہلے روزہ میں پیاس کی تاب نہ لاکر ظہر کے بعد پانی پی لیا تھا اس کا سبب جو بیان کیا ہے وہ ان کے زمانہ طفلی کی طرح ہی معصومیت سے بھرا ہوا ہے۔ وہ لکھتے ہیں

”یہ پانی گھڑے کا نہ تھا اور گرم تھا، لیکن کیا کرتا، بالکل مجبور ہو گیا تھا۔ یہ مذہبی احکام کی خلاف ورزی نہیں، پیاس کے سامنے سپر اندازی تھی۔“(۴۵)

تلخ وشیریں تجربات کے مجموعے کا دوسرا نام ہی زندگی ہے۔ قیام بھوپال کے دوران عابد سہیل بھی ان تجربوں کے ساتھ بڑے ہو رہے تھے مگر انھوں نے ”جو یاد رہا“ لکھ کر ان تجربات کو تاریخ کا حصہ بنا دیا۔ ان کی شخصیت سازی میں بھوپال کو کتنی اہمت ہے اس پر گفتگو مذکورہ بالا اقتباسات میں کی جا چکی ہے۔ مگر ان اندراج سے مصنف کے مزاج کا ایک اہم پہلو آشکار نہیں ہو سکا ہے جس کے لئے وہ ہمیشہ ہی پہچانے گئے۔ یعنی ان کی ہر دلعزیزی۔ یہ شناخت ادب یا صحافت نے نہیں دی بلکہ یہ خوبی انھیں اپنی انسان دوستی کے سبب موصول ہوئی۔ بچپن سے ہی ان کی طبیعت میں درد آدمیت کے لئے بہت جگہ رہی۔ دوستوں سے وعدے اور پھر ایفائے عہد کی پابندی کا حد درجہ خیال انھیں ہر کام کرنے پر آمادہ کر لیتا اب چاہے اس کے لئے حشمت پھوپا کی گھڑی ہی کیوں نہ چرانی پڑی ہو۔

بھوپال ہی میں وہ محمد عابد سے ”عابد سہیل“ بنے۔ اس کا سبب بھی ایک دوستی تھی۔ ان کے دوست کی موت ایک غیر معلوم پھل کھانے کی وجہ سے ہوئی تھی جس کو عابد سہیل ہی نے ایک درخت سے توڑ کر پیش کیا تھا۔ یہ پھل عابد سہیل سمیت ان کے دو دوستوں نے کھایا تھا جن میں احمد سہیل بھی شامل تھے۔ عابد سہیل اور دوسرا دوست چھوٹے میاں تو کچھ دن بیمار رہنے کے بعد صحت مند ہو گئے لیکن احمد سہیل اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ یہی صدمہ محمد عابد کے لئے اس درجہ سنگین تھا کہ اس کی یاد نے انھیں ”عابد سہیل“ بنا دیا۔ اس واقعہ کے اختتامی الفاظ کتنے جذباتی اور دوستی ومحبت سے لبریز ہیں ملاحظہ کیجئے

”اس غم کا نشتر اس قدر گہرا تھا کہ اسی دن، اسی وقت، سید محمد عابد، سید عابد سہیل ہو گیا۔

"اب کہاں جاؤ گے سہیل، اب تو ساری زندگی کا ساتھ نبھانا پڑے گا، میں تمھیں
اپنے آپ سے ایک لمحہ کے لئے جدا نہ ہونے دوں گا۔"(۴۶)

یا پھر وہ مقام بھی قابل ذکر ہے جب عابد سہیل بھوپال سے اورئی کے لئے نکلتے ہیں مگر غلط ٹرین پر سوار ہوجاتے ہیں اور ٹی ٹی کے کہنے پر کچھ دور ایک اسٹیشن پر اتر جاتے ہیں۔ یہاں انھیں ایک اورنگ آباد کے مولوی صاحب ملتے ہیں جن کا لڑکا ڈوب کر مر جاتا ہے۔ وہ اپنے وطن اورنگ آباد جارہے تھے۔ وہ مولوی صاحب عابد سہیل میں اپنے بیٹے کی شباہت محسوس کر کے رونے لگتے ہیں۔ عابد سہیل اور مولوی صاحب دونوں ہی اپنی روداد ایک دوسرے کو سناتے ہیں۔ مولوی صاحب یہ بھی بتاتے ہیں کہ جو ٹکٹ عابد سہیل نے لیا ہے وہ پرانا ہو چکا ہے اس کے ذریعہ اورئی پہنچنا ممکن نہیں۔ وہ عابد سہیل کو اپنے ساتھ اورنگ آباد چلنے کو کہتے ہیں کہ دس پندرہ دن بعد وہ واپس آئیں گے تو انھیں ان کے گھر پہنچا دیں گے۔ عمومی طور پر ان مواقع پر کوئی بھی شخص اپنے گھر پہنچنے کی فکر میں ہوتا ہے لیکن عابد سہیل ان کا زاروقطار رونا دیکھ کر خود کی تکلیف اور بے چینی موخر کر دیتے ہیں اور ان کے ساتھ چلنے پر آمادہ ہوجاتے ہیں۔ ان کا خیال ہوتا ہے کہ اس سے ان کا درد تھوڑا کم ہوجائے گا۔ عابد سہیل نے یہاں بھی اپنی بڑائی کو نمایاں کرنے کی کوشش نہیں کی ہے بلکہ اورنگ آباد جانے کے محرکات میں جو دیگر چیزیں شامل تھی انھیں بھی ذکر کیا ہے۔

"چاہتا تو میں یہی تھا کہ جلدی سے جلدی اورئی چلا جاؤں لیکن ان کی حالت اور
بار بار کا رونا دیکھ کر میرا دل پسیج گیا اور میں نے کہا" آپ ہی پہنچا دیجئے گا۔"

میرے اس جواب میں پھوپا کا ڈر بھی ضرور سمایا رہا ہوگا۔ میں نے سوچا ہوگا کہ
بھوپال کے اسٹیشن پر میری تلاش کی جارہی ہوگی"۔(۴۷)

بغیر کسی کو خبر کئے عابد سہیل اورنگ آباد پہنچ گئے بھوپال والے سمجھتے رہے کہ وہ اورئی چلے گئے ہیں ان کے پھوپا نے بھی رسمی اطلاع بھیج دی لیکن جب وہ دس پندرہ دن تک اورئی نہ آئے تو معاملہ سنجیدہ ہوگیا اور ظاہر ہے اس سے دونوں خاندانوں کے مابین افتراق کی ایک گہری لکیر پڑگئی جو چالیس پینتالیس سال بعد ان کی پھوپی زاد بہن نے مٹائی۔ اس تلخی کا سبب عابد سہیل خود کو مانتے تھے اور حساس طبیعت نے اس بات کا اعتراف واضح لفظوں میں کیا۔

مصنف کی انسان دوستی اور خالص محبت جو نصف کتاب سے قاری کی ہمدردانہ توجہ کا باعث بنتی ہے

اس کا باقاعدہ طور پر آغاز بھوپال سے ہی ہوتا ہے۔ وقتی کسی کے لئے رنجیدہ ہونا انسان کی فطرت ہے لیکن کسی کا نام ہمیشہ کے لئے اپنے ساتھ جوڑ لینا سچی محبت کے سوا اور کچھ نہیں۔ ان کی یہ نیک خصلت ان کی وراثت تھی جس کا مشاہدہ وہ روزانہ اپنے گھر میں کرتے تھے۔ جب مولوی صاحب عابد سہیل کو گھر پہچانے آتے ہیں تو دادے ابا مولوی صاحب کو واپس نہیں جانے دیتے بلکہ خانوادے کی ایک فرد کی حیثیت سے انھیں روک لیتے ہیں۔ انھوں نے وہ دن بھی دیکھا جب اورئی چھوڑتے وقت ان کی والدہ نے منیر کی اماں سے باورچی خانہ کا سارا سامان رکھ لینے کو کہا لیکن منیر کی اماں نے یادگار کے طور پر صرف چمٹا لیا۔ یہ وہ دور تھا جس میں عابد سہیل زندگی کے سفر کو جاری رکھے تھے۔ اس ہمدردی کا جذبہ اس قدر شدید تھا کہ انھیں اپنے چچا کے اُس فعل پر بھی غصہ آتا ہے جب ایک غریب ملازم قدیر میاں ان کے چچا (نواب چچا) کو بڑی خوش آمد کے بعد اپنی بیٹی کی شادی میں آنے کے لئے راضی کر لیتے ہیں۔ مگر چارپائی پر ان کے سرہانے بیٹھ جانے کیوجہ سے نواب چچا تقریب چھوڑ کر چلے آتے ہیں ان کا دل قدیر میاں کی معافی اور گڑگڑانے پر بھی نہیں پسیجتا۔ اس عمل سے عابد سہیل نہایت رنجیدہ ہوتے ہیں اور اپنی دلی کیفیت اس طرح پیش کرتے ہیں۔

"نواب چچا کا رویہ مجھے ذرا اچھا نہ لگا، میرا بس چلتا تو وہیں رک جاتا" (۴۸)

ہمدردی کا یہ جذبہ ان کے ساتھ ساتھ جوان ہوا اور عمر کی پختگی کے ساتھ اس میں استحکام آتا چلا گیا۔ ڈاکٹر صبیحہ انور نے راقم سے ذاتی گفتگو میں بتایا تھا کہ تقریباً 12-13 سال قبل ان کے "نامی پریس" میں ایک لڑکی کمپوزنگ وغیرہ کا کام کرنے کے لئے آتی تھی۔ اس نے ایک دفعہ ڈاکٹر صبیحہ انور سے کہا کہ اگر اس کے پاس کمپیوٹر ہوتا تو وہ گھر پر بھی یہ کام کر کے اپنے اخراجات پورے کر سکتی ہے۔ یہ ذکر صبیحہ انور نے باتوں باتوں میں عابد سہیل کے سامنے کر دیا۔ کچھ دن بعد عابد سہیل اپنے کمپیوٹر کے ساتھ نامی پریس آئے اس وقت پریس کے مالک خواجہ انور صاحب (ڈاکٹر صبیحہ انور کے شوہر) موجود نہیں تھے۔ انھوں نے وہ کمپیوٹر وہاں رکھا اور واپس آ گئے۔ کچھ دن بعد جب انور صاحب نے ان سے کہا کہ آپ اپنا کمپیوٹر یہاں رکھ گئے تھے تو عابد سہیل نے جواب دیا کہ جی ہاں یہ کمپیوٹر اس بچی کو دے دیئے گا جس کا ذکر صبیحہ انور نے کیا تھا میرے لئے میرے بیٹے ساجد دوسرا کمپیوٹر لا دیں گے۔ آج سے تیرہ سال قبل کمپیوٹر کی قیمت 50 ہزار سے کم نہ ہوگی۔ حیرت یہ نہیں کہ اتنی قیمتی چیز عابد سہیل نے کسی کو عنایت کر دی بلکہ تعجب اس بات پر ہے کہ جب صبیحہ انور صاحبہ نے کہا کہ وہ لڑکی آپ سے ملاقات کر کے آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہے تو عابد سہیل نے بڑی عاجزی سے کہا ایسا ہرگز مت کیئے گا میں اس کا سامنا نہیں کر پاؤں گا۔ عابد سہیل کو یہ نیکیاں وراثت میں ملی تھیں جن کی حفاظت وہ آخرِ عمر تک کرتے رہے۔

عابد سہیل بچپن سے ہی مذہبی، محبتی، شرارتی ہونے کے ساتھ ساتھ حساس اور خود دار بھی تھے۔ بھوپال ترک کرنے کا سبب بھی یہی احساس تھا جو انھیں حشمت پھوپا کی گھڑی چرانے کے بعد ہوا تھا۔ جب ان کی چوری پکڑی گئی اور انھیں اس کی سزا دی گئی تو وہ سخت ناراض ہوئے۔ مگر یہاں بھی مصنف نے تقاضائے عمر اور توازن بیان کا پورا خیال رکھا اور اس ناراضگی کے ذکر کے ساتھ یہ بھی لکھ دیا

> "وہ عمر اپنی غلطی ماننے کی نہیں ہوتی چنانچہ میں اپنی حرکت کے لئے طرح طرح کی تاویلیں تلاش کرتا، اگر چہ پھوپا کی محبتیں بھی یاد آتیں۔ وہ مجھے بالکل اپنے بیٹوں کی طرح چاہتے تھے۔۔۔ یہ سب مجھے اس وقت بھی یاد تھا لیکن میں پٹائی سے زیادہ شرمندگی کا مارا ہوا تھا اور کسی سے آنکھ ملا کر بات بھی نہ کر پاتا ۔"(۴۹)

اس شرمندگی نے انھیں اس قدر پریشان کیا کہ انھوں نے کسی اطلاع کے بغیر اورئی جانے کا فیصلہ کر لیا اور اپنی ساری آمدنی جوان کے والد انھیں بھیجا کرتے تھے، ٹکٹ خریدنے کے لئے جمع کرنے لگے۔

خودنوشت کا یہ موڑ نہایت اہم ہے کیونکہ یہاں سے نہ صرف کتاب نہایت دلچسپ اور اپنے ارتقائی منازل تیزی کے ساتھ طے کرتی ہے بلکہ مصنف کی شخصیت کو مزید ابھارنے اور نکھارنے لگتی ہے۔

اورئی کی آمد کے بعد عابد سہیل کی تعلیم کا سلسلہ پھر شروع ہوتا ہے۔ نوخیز عمر کے عابد سہیل اب ایسے دور میں زندگی گزارنے لگے جو تقسیم ہند کے قریب تھا یعنی سیاسی ہلچل بہت تیز تھی اور فرقہ واریت اپنے پیر پسارنے لگی تھی۔ عابد سہیل کمیونسٹ پارٹی سے بعد میں منسلک ہوئے لیکن ان کی طبیعت میں "نظریہ" کی اہمیت اور احترام اسی زمانے میں سرایت کر گیا تھا کیونکہ ان کے گھر میں ہی دو نظریوں کے پرچم لہرا رہے تھے۔ ان کی والدہ مسلم لیگ کی حمایتی تھیں جب کہ ان کے والد کانگریسی نظریات سے اتفاق رکھتے تھے۔ عابد سہیل نے اپنے لڑک پن میں "بچہ مسلم لیگ" کی بنیاد ڈالی جس میں وہ صدر اور شیام، سکریٹری کی حیثیت رکھتے تھے۔ انھوں نے اس تنظیم کے تحت ایک پروگرام کا انعقاد بھی کیا جس کی صدارت شاعر خواجہ مجذوب غوری نے کی اور نسیم قریشی نے شرکت کی۔ اس تنظیم کا یہ پہلا اور آخری جلسہ تھا اس کے بعد نہ تو تنظیم ہی باقی رہی نہ ہی جلسہ ہوئے۔ لیکن یہاں سے عابد سہیل کی طبیعت میں ایک فکری رجحان کو اپنانے اور اس کے لئے شد و مد کے ساتھ کام کرنے کے جذبے نے جگہ ضرور بنالی۔ جوانی کے ساتھ ان کا یہ جذبہ بھی توانا ہو گیا اور وہ با قاعدہ طور پر کمیونسٹ پارٹی سے وابستہ ہوئے۔ اس کی حمایت میں انھوں نے اپنا سب کچھ "تیاگ" دیا تھا۔ بقول مصنف

ہم نوجوان جو پارٹی میں سرگرم تھے ان لوگوں میں نہ تھے جن کے لئے اس سب
کی حیثیت "ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے" کی رہی ہو۔ انقلاب ہماری
منزل تھی، ہمارا دین تھا، ہمارا ایمان تھا''۔(۵۰)

عابد سہیل اپنے ابا کے انتقال کے بعد لکھنؤ چلے آئے اور یہاں کرسچین کالج اور لکھنؤ یونیوسٹی سے تعلیم مکمل کی۔ اپنے مزاج اور اخلاق کی وجہ سے وہ طالب علمی کے زمانے سے ہی مقبول رہے۔ یہاں انھیں دوست اور استاد دونوں کی ہمدردیاں حاصل تھیں۔ ایک دو بار ایسے مراحل بھی آئے کہ عابد سہیل استاد کی مخالفت کے باوجود اپنی بات پر ثابت رہے حالانکہ یہ ان کا مزاج نہیں تھا اس لئے احتراماً استاد کی بات کو سر آنکھوں پر رکھا لیکن یہاں بھی طریقہ کار وہ اپنایا کہ خود کی بھی سبکی نہیں ہوئی اور استاد کا وقار بھی مجروح نہیں ہوا۔ یہ واقعہ کرسچن کالج کا ہے۔ یہ ذکر کافی دلچسپ ہے کیونکہ اس میں مسٹر راٹھور جو اسٹوڈنٹس کو ملٹری ٹریننگ کراتے تھے، عابد سہیل کی سست روی پر غصہ میں کہہ دیا تھا

"Abid, Can't you do military training properly? if you do not want to do military training, why don't you go to your bloody pakistan"(۵۱)

ظاہر ہے اس جملہ پر کسی بھی ہندوستانی کو غصہ آجائے گا وہی ہوا اور عابد سہیل نے غصہ میں

Why don't you go to your bloody England?

کہہ دیا۔ بات پرنسپل تک پہنچ گئی اور دونوں میں سے کوئی بھی ایک دوسرے سے معافی مانگنے کے لئے تیار نہیں ہو رہا تھا۔ ایک دن چائے کے ہوٹل پر مسٹر راٹھور نے عابد سہیل سے کہا

Abid why don't you understand that both of us belong to the minority community

اس بات کا جواب میں عابد سہیل نے یہ تو کہہ دیا کہ

Sir, you are again talking nonsense.

مگر انھیں اپنی اس ترش کلامی پر بڑا افسوس ہوا۔ اس کے چار دن بعد پرنسپل نے انھیں بلایا اور راٹھور صاحب سے معافی مانگنے کو کہا مگر عابد سہیل بضد رہے کہ پہلے راٹھور صاحب معافی مانگیں۔ اس پر راٹھور

صاحب نے ایک لفافہ ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا

This is the apology letter that you want

کسی کو نیچا دکھانا عابد سہیل کے مزاج کا حصہ نہیں تھا اور وہ بھی اپنے استاد کے بارے میں وہ ایسا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ یہ عمر کا تقاضہ تھا اور" پاکستان بھیجنے" کی بات تھی جس نے انھیں اس قدر ضدی بنا دیا تھا مگر جیسے ہی راٹھور صاحب کا یہ لفافہ انھیں ملا انھوں نے اسے پھاڑ کر پھینک دیا اور اپنے استاد سے کہا کہ غلطی آپ کے شاگرد نے کی تھی، آپ نے Fatigue کی سزا دینے کے بجائے مجھے مارا کیوں نہیں؟

عابد سہیل کے اس عمل اور کردار نے انھیں پورے کالج میں مشہور ومقبول کر دیا۔ ان واقعات سے مصنف نے اپنی جوانی کے ان ادوار کو دہرایا ہے جہاں ان کی شخصیت میں ایک طوفان تھا اور جوانی کچھ کر گزرنے کے لئے ہمہ تن تیار رہتی تھی۔ یہی جوش اور خودداری تھی جس نے مصنف کو تنگ دستی کے باوجود کبھی دوسرے کے سامنے سبک نہیں ہونے دیا۔ اس خودداری کا اخذ وقبول بھی انھوں نے بھوپال ہی میں کیا تھا مصنف نے وہاں کے ایک واقعہ سے خود کو بہت متاثر بتایا ہے۔ بقول صاحب کتاب

"انھیں دنوں ایک عجیب واقعہ ہوا جس نے میری زندگی پر دور دور تک اثر ڈالا" (۵۲)

اس واقعہ کے ضمن میں عابد سہیل نے ایک مفلس خاندان کا ذکر کیا ہے۔ جو خودداری کے سبب دست دارزی پر آمادہ نہیں ہو رہا تھا مگر مجبوری کے آگے کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ ان کے حالات کی خستگی کا یہ عالم تھا کہ پاؤ بھر گوشت میں سالن بنتا تو سالن کھا لیا جاتا بوٹیاں چھوڑ دی جاتی، پھر اسی گوشت کے ساتھ اگلے دن ترکاری بنتی۔ اس بار بھی گوشت کو صرف دیکھنے اور سونگھنے کی ہی اجازت تھی کیونکہ تیسرے دن ان ہی بوٹیوں کے کباب بن جاتے۔ اس خاندان کی یہ حالت جب عابد سہیل کے والد کو پتہ چلی تو انھوں نے ان کو پیسہ دینے کی بات کہی لیکن اہل خانہ کے سربراہ نے یوں ہی پیسہ لینے سے انکار کر دیا آخر کار مکان گروی رکھنے پر معاملہ طے ہوا مگر عابد سہیل کے والد نے یہ شرط رکھی کہ اگر وہ یہ قرض ادا نہیں کر پائے تو بھی مکان انھیں کا ہی رہے گا۔ یہ شرط سن کر اہل خانہ رو دئے تھے۔ عابد سہیل پر اس واقعہ کا بہت اثر ہوا تھا کیونکہ زندگی کی منازل طے کرنے میں انھیں بھی ایسے ہی تنگ راہوں سے گزرنا پڑا تھا۔ وہ لکھتے

"وہ (غریب گھر کی خاتون) مجھے دیکھتے دیکھتے خاموش ہوگئی تھیں لیکن اس نامکمل جملے میں بھی مفلسی کی جو لپکیں، حسرتِ تعمیر کی جو آنچ اور دل گرفتگی تھی اس

کے احساس سے میں بھی جس کی عمر اس وقت بمشکل آٹھ نو سال رہی ہوگی، نہ بچ
سکا۔لیکن دو ایک دن میں سب کچھ بھول گیا اور یہ جملہ شاید کیا ہرگز یاد نہ رہ جاتا
اگر بعد کے واقعات اسے یادداشت کا حصہ نہ بنا دیتے۔"(۵۳)

اخراجات کو پورا کرنے کے لئے انھوں نے ٹیوشن پڑھایا، صحافت سے وابستہ ہوئے اور کتابیں بھی فروخت کیں۔ ہر پیشہ نے انھیں نئے تجربات سے ہمکنار کیا۔ ٹیوشن میں وسیع النظر اور وسیع المشرب افراد سے ملاقات ہوئی۔ صحافت سے وہ ایک عرصہ دراز تک جڑے رہے یہاں انھوں نے تلخ و شریں دونوں حالات دیکھے۔ یہاں کی فضا بالخصوص حیات اللہ انصاری اور چلپت راؤ سے انھوں نے بہت کچھ سیکھا۔ کتاب فروشی کے پیشہ نے اس سیکھ میں دو چند اضافہ کر دیا۔ پہلے تو انھوں نے سڑک کے کنارے کتابیں بیچنا شروع کی تھیں اس وقت انھیں اپنے پرانے دن یاد آ گئے تھے۔نہایت جذباتی یہ اقتباس دیکھئے

"ابا کے انتقال سے قبل کی زندگی عیش و عشرت کی نہ تھی لیکن موجودہ حالات میں
وہ دن شہنشاہی کے معلوم ہوتے۔اونچے اونچے خواب تو کبھی نہ دیکھے تھے، لیکن
ذہن میں مستقبل کا جو دھندھلا سا تصور تھا، ان کے بکھر جانے کے باوجود یہ نہ
سوچا تھا کہ سڑک کے کنارے چھینٹ کے کپڑے پر کتابیں اور رسالے پھیلا کر
انھیں فروخت بھی کرنا پڑے گا۔"(۵۴)

ایک سپاہی نے جب یہ" کاروبار شوق" کی دوکان اٹھا دی تو مصنف نے گھروں گھروں جا کر کتابیں بیچنے کا کام شروع کیا۔ظاہر ہے کتابیں وہی خریدتے ہیں جو تعلیم یافتہ اور اکثر باحیثیت افراد ہوتے ہیں۔ عابد سہیل جہاں جہاں کتاب فروخت کرنے کے لئے گئے ان میں متوسط درجے سے لیکر اعلیٰ طبقہ کے لوگ سبھی شامل تھے بلکہ کابینی وزیر اور وزیر اعلیٰ تک سے عابد سہیل نے اس تعلق سے ملاقاتیں کی۔جس میں جھارکھنڈے رائے، چودھری چرن سنگھ وغیرہ شامل ہیں۔ان واقعات میں عابد سہیل نے اپنی کتب فروشی کے علاوہ اس دور کی سیاست کو بھی جگہ دی ہے۔

☆ سیاست اور سیاستداں

خودنوشت میں عابد سہیل نے صرف اپنے نظریات یا اپنی پارٹی کے مفادات کو ہی نہیں لکھا ہے بلکہ یہاں

ان کی ”توازن نگاری“ نظر آتی ہے کہ کمیونسٹ کے علاوہ کانگریس، مسلم لیگ، بی جے پی اور دیگر سیاسی تنظیموں کے بارے میں بھی وہ دیانتداری سے کام لیتے ہیں۔

ہندوستانی سیاست اپنے آغاز کے کچھ عرصے بعد سے ہی انحطاط اور اخلاقی بحران کا شکار ہونے لگی تھی۔ عہدہ کا لالچ اور حکومت کے نشے نے اس میں فریب اور مکاری کو پیر پسارنے کا موقع دیا۔ پہلے زیادہ تر لیڈران ملک و قوم کی خدمت کے لئے اس میدان میں قدم رکھتے تھے مگر آج کی صورتحال سے کون واقف نہیں۔ عابد سہیل کی یہ خودنوشت اس حوالے سے بھی کافی اہم کہ یہاں دونوں زمانے (یعنی عابد سہیل کے دور اور موجودہ دور) کی سیاست کا خاکہ موجود ہے۔ سن 47 میں جو غدر مچا اس کا بیان بھی ہے اور پھر جو سیاسی گھمسان ہوا اس کا ذکر بھی۔ مصنف نے تقسیم ہند کا مختصر مگر جامع خاکہ محض دو صفحات میں لکھا ہے۔ گویا یہ ایک فہرست ہے ان تمام کتابوں کی جو تفصیل کے ساتھ تقسیم ہند پر لکھی گئی ہیں۔ مصنف نے مطالبہ پاکستان میں شدت اور مسلم لیگ کی تقویت کی وجوہات پر بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ انھوں نے مطالبہ پاکستان کے بارے میں یہ بتایا کہ پہلے اس کا مقصد صرف مسلمانوں کے لئے کچھ مراعات حاصل کرنا تھا اور اس مطالبہ سے کسی ہندو کو کوئی خوف بھی نہیں محسوس ہوتا تھا۔ یہی سبب تھا ان کے وطن اورئی میں ہندو مسلمان سب اس طرح رہتے کہ تفریق مشکل تھی۔ لیکن ایک واقعہ کے بعد سب کچھ بدل گیا۔ ہوا یوں کہ اورئی میں غازی محمود دھرم پال کی تقریر کا اہتمام کیا گیا اور ان کے لئے پوسٹر میں لکھا گیا کہ وہ پہلے ہندو تھے پھر مسلمان بنے ہیں اور یہ بھی درج تھا کہ انھوں نے بہت سے غیر مذاہب کے عالموں کو مناظرے میں شکست دے رکھی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی تقریر میں اپنے مذہب کی بڑائی سے زیادہ دوسرے مذاہب کی برائی اور کمیاں گنائی جاتی ہیں اور یہی ہوا۔ بقول عابد سہیل

> ”دیر رات تک کی اس تقریر کے کتنے سامعین کے دل کدورتوں سے پاک ہوئے، خشوع وخضوع سے نمازیں پڑھنے والوں کی تعداد میں کتنا اضافہ ہوا اور کتنوں کے دل ودماغ ایمان کی روشنی سے منور ہو گئے یہ نہ مجھے معلوم ہوا نہ اس کا پتہ لگانے کی میری عمر ہی تھی لیکن یہ ضرور یاد ہے کہ اگلے دن شام ہوتے ہوتے مسلمانوں کے گھروں پر چاند تاروں سے مزیّن سبز پرچم لہلہا رہا تھا۔۔۔غازی محمود دھرم پال کی تقریر نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے خلاف صف آرا تو نہیں کیا لیکن مسلمانوں میں اپنے وکیلوں، ڈاکٹروں اور افسروں کی غیر معمولی اہمیت کا احساس اور ان کی خوبیوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کا جذبہ ضرور پیدا کر دیا اور زندگی کو ہندو۔مسلمان کے

پیمانوں سے آنکنے کی للک بھی۔ ۔ ۔ ۔مذہب کی بنا پر ترجیح کی اس جنگ
میں اقتصادی طور سے مسلمانوں کا یقیناً نقصان ہوا ہوگا۔"(۵۵)

یہ واقعہ کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا بلکہ ایک منصوبہ بند سازش کا حصہ محسوس ہوتا ہے۔جس کی طرف عابد سہیل
نے یہ کہتے ہوئے اشارہ کیا

"کہا جاتا ہے کہ ان (غازی محمود دھرم پال) کے سگے بھائی بالکل اسی طرح
ہندو مذہب کی خدمات انجام دے رہے تھے"(۵۶)

ظاہر ہے کہ ایسی ماحول سازی جب اورئی جیسے چھوٹے گاؤں میں کی جا رہی تھی تو دوسرے بڑے
اور اہم علاقوں میں اس کی نوعیت کتنی تشویش ناک ہوگی۔ یہی سبب تھا کہ ان رویوں نے ملک کی رگ و پئے میں
منافرت اور مذہبی تعصب کے زہر کو پھیلا دیا۔نتیجتاً " کچھ نہ دوا نے کام کیا"۔ظاہر ہے کہ تقسیم ہند کی تمام باریکیاں
چند صفحات میں تو سمجھائی نہیں جا سکتی لیکن ایک ماہر اور "سمندر" کو "کوزے" میں سمونے والا فن کار کم الفاظ
میں بنیادی وجوہات اور فاش غلطیوں کی نشاندہی ضرور کرسکتا ہے یہی فنکاری عابد سہیل نے ان دو صفحات میں دکھائی
ہے۔مصنف نے مسلم اکثریت اور ہندو اکثریت صوبوں کو الگ الگ تقسیم کرنے والے فارمولے فیڈریشن کے
ناکام ہونے کی نشاندہی کرنے کے بعد لکھا ہے

"اب لارڈ ماونٹ بیٹن کو مارچ 1948 تک کسی بھی طرح ہندوستان سے گلو
خلاصی حاصل کرنے کی ہدایت دے کر بھیجا گیا لیکن ماونٹ بیٹن ،لیڈی ماونٹ
بیٹن اور پنڈت نہرو کے پر خلوص تعلقات اور جناح کی جلد بازی نے یہ منزل
آسان اور قریب تر کر دی

ملک کی تقسیم روکنے کے لئے گاندھی جی نے آخری کوشش کے طور پر جناح کو یہ
پیش کش کی کہ وہ مطالبۂ پاکستان سے دستبردار ہو جائیں تو کانگریس انھیں ملک کا
پہلا وزیر اعظم بنانے کے لئے تیار ہے لیکن پنڈت نہرو اور سردار پٹیل نے گاندھی
جی کو یہ پیش کش واپس لینے پر مجبور کر دیا۔اگر چہ مسلم لیگ نے اس پیش کش پر کوئی
ردعمل ظاہر نہیں کیا تھا اور وہ مذبذب بھی تھی لیکن اسکے واپس لیے جانے کے بعد
عام تاثر یہ پیدا ہو گیا کہ تقسیم ہندوستان کی قسمت بن گئی ہے۔"(۵۷)

ملک تقسیم ہو گیا لیکن دیگر دور اندیش اور محب وطن کی طرح عابد سہیل کے دل و دماغ پر بھی اس کا گہرا اثر ہوا۔ ان کی شخصیت میں مذہب اور وطن کی محبت دو متضاد چیزیں نہیں تھیں کہ وہ پاکستان کے مطالبہ کو جائز ٹھہراتے یا پھر جناح کو صرف اس لئے درست قرار دیتے کہ وہ ایک مسلمان تھے۔ ان کا نظریہ مستحکم اور نہایت واضح تھا جس میں نفرت نہیں ترقی کی امنگ تھی ان کا یہ اقتباس دیکھئے

۔۔۔ہندوستان کے تازہ اور باسی وطن پرستوں کو کسی نے بتایا ہوتا کہ کسی دوسرے ملک، کسی دوسری قوم اور کسی دوسرے نقطہ نظر سے نفرت کئے بغیر بھی اپنے وطن سے محبت کی جا سکتی ہے اور یہ محبت زیادہ ہی ثمر آور ہوتی ہے۔"(۵۸)

مصنف کی یہ کتاب اس کی غیر جانبدار شخصیت سے ہمیں روشناس کراتی ہے۔ مصنف مسٹر جناح کے فیصلہ پر کھلی تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں

جناح فرقہ پرست تھے۔ نہ سیاستدں۔ وہ ایک نہایت اعلیٰ درجے کے ضدّی اور خود پسند وکیل تھے۔ انھیں ایک بار کانگریسیوں نے بہت ذلیل کیا تھا جس کا وہ بدلہ لینا چاہتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے مسلمانوں کے دل و دماغ میں پاکستان کا مقدمہ قائم کیا اور پھر خود ہی یہ مقدمہ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اسے جیت کر بھی دکھایا۔ انھیں اس سے قطعاً دلچسپی نہ تھی کہ مقدمے کی کامیابی کی صورت میں اس وقت کے دس کروڑ مسلمانوں کو کن مسائل اور مصائب کا سامنا کرنا پڑے گا۔ انھوں نے یہ بھی نہ سوچا کہ تقسیم ہند کے نظام کے تحت انھوں نے جو علاقہ پاکستان کے لئے حاصل کیا ہے اس سے زیادہ علاقہ ویسے بھی مسلمانوں کا تھا۔"(۵۹)

اس اقتباس سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ عابد سہیل نے خود نوشت میں صرف جناح کو ٹارگیٹ کیا اور اس وقت کی حکومت کو صاف شفاف بنا کر پیش کیا صرف اس لئے کہ وہ تقسیم کے خلاف تھی۔ بلکہ اسی اقتباس کے ذرا سے فاصلہ پر عابد سہیل نے یہ بھی لکھا ہے

"ہندوستانیوں کے ذہن میں جناح تقسیم ہند کی علامت بن گئے ہیں لیکن کسی بر صغیر کی تباہی یا کامرانی کسی فرد واحد کے اعمال کا نتیجہ نہیں ہو سکتی۔ تقسیم ہند کے المیہ کی ذمے دار کانگریس بھی تھی جس کے بعض فیصلوں نے مسلمانوں کو مسلم لیگ

کی جھولی میں ڈال دیا۔"(۶۰)

مصنف کی باتیں "دعوے بلا دلیل" کی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ خودنوشت کے آئندہ حصوں میں اس کی مثالیں بھی پیش کی ہیں مثلاً کانگریس کا ان امیدواروں کوٹکٹ سے محروم رکھنا جن کی عزت ان کے علاقے میں بلا تفریق مذہب وملت کی جاتی تھی۔ اس میں زیادہ نقصان مسلم قیادت کو ہوا۔ اس وقت کا مسلمان کشمکش میں تھا کہ کس پرچم کے زیر سایہ اپنی نئی زندگی کا آغاز کرے۔ ایک طرف جناح اور ان کے لواحقین تھے تو دوسری طرف سیکولر کا نعرہ دینے والی کانگریس اور ساتھ میں مولانا آزاد جو اس وقت مسلم قیادت کا ستون تھے۔ یہاں پر مصنف نے ایک باریک تجزیہ نگار کی طرح ایک جملہ کی مدد سے چھائی ہوئی اس دھند کو کافی حد تک صاف کرنے کی کوشش کی اور لکھا کہ اس وقت نوجوانوں میں مغربی رجحان بڑھ رہا تھا اور کانگریس نے مولوی حضرات کا سہارا لیکر مسلمانوں کو لبھانے کی کوشش کی۔ اس کے برخلاف جناح اور ان کے ساتھی کسی حد تک ترقی پسندی کے دعویدار تھے۔ اس جملہ کے ساتھ مصنف نے ایک پوری فکر کو مہمیز کرنے کی کوشش کی ہے جس پر غور وفکر کرنے کی ضرورت ہے۔ اقتباس دیکھیں

> "پاکستان اور اس وقت کی سیاست پر درجنوں کتابیں لکھی گئیں لیکن مجھے نہیں معلوم کہ مسلمانوں اور مسلم نوجوانوں میں جناح اور مسلم لیگ کی مقبولیت کے اسباب کا کوئی مطالعہ ہوا ہے یا نہیں۔ میرے خیال میں نہیں ہوا۔ سیاسی واقعات کی کڑیاں جوڑنے کے مقابلے میں اس طرح کے گہرے مطالعوں کی اب بھی ضرورت ہے کیوں کہ دنیا ابھی ختم نہیں ہوئی ہے اور نہ بدقسمتی سے ہندو-مسلم تفریق"۔(۶۱)

یہ حقیقت ہے کہ تقسیم ہند نے مسلمانوں کے احترام اور عزت کو کافی نقصان پہنچایا۔ اس المیہ سے قبل صورت حال کتنی مختلف تھی اس کا اندازہ مصنف کے زمانے اور ماحول کے بیانیے سے بخوبی ہوتا ہے۔
یہاں پر صرف چند خاموش سطریں پیش خدمت ہیں جو مسلمانوں کی حالت زار کا اعلان کرتی نظر آرہی ہیں۔

> "مسلمانوں سے منصفانہ سلوک ان دنوں بھی نہیں ہوتا تھا۔ مرکزی وزیر داخلہ نے ایک خفیہ سرکلر کے ذریعہ پولیس میں مسلمانوں کی بھرتی پر پابندی لگا دی تھی۔۔۔۔ مسلمانوں سے ملازموں اور زندگی کے ہر شعبے میں تفریق برتی جاتی تھی پھر بھی صورت حال آج سے بہتر تھی۔"(۶۲)

عابد سہیل کی یہ کتاب قاری کو ماضی کے ان ادوار میں لے کر جاتی ہے جہاں قاری پر حیف انداز میں

"کاش" کہنے پر مجبور ہوتا ہے۔ کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو آج ملک کی صورت کچھ اور ہوتی۔ افسوس صرف مسلمانوں کی صورتحال پرنہیں ہوتا بلکہ سیاست کی بتدیل ہوتی شکل پر بھی ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے۔

یہ کتاب ہمیں اس وقت کا سیاسی منظر نامہ اور سیاستداں کے اخلاق اور رویوں کے بارے میں اچھی خاصی معلومات فراہم کرتی ہے۔ حیرت ہے کہ اس وقت کی سیاست آج کے زمانے سے کتنی مختلف تھی۔ اس ذیل میں ایک نہیں بلکہ کئی مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ یہاں قابل دید بات یہ بھی ہے کہ عابد سہیل کمیونسٹ پارٹی سے وابستہ تھے ،اگر موجودہ سیاست کو پیش نظر رکھا جائے تو مصنف کو اپنی پارٹی کے علاوہ دیگر گروہ اور ان کے اراکین کو ہر محاذ پر آڑے ہاتھوں لینا چاہئے تھا یا پھر ان کی اچھائی کو پس پشت رکھ کر خامیوں اور نقائص کو اجاگر کرنا چاہئے تھا۔ لیکن مصنف کی غیر جانبداری یہاں بھی کارفرما نظر آتی ہے۔ اس کتاب کی یہ خصوصیت ہے کہ مصنف نے سیاست کی رخصت ہوتی رواداری اور سیاستداں کے اخلاقی نقوش کھینچ دیئے ہیں جو آئندہ نسلوں کو یہ باور کراتے رہیں گے کہ پہلے کی سیاست میں کتنی سچائی ومحبت ہوا کرتی تھی۔

عابد سہیل نے اس ضمن میں محمد علی جناح، جھارکھنڈے رائے، چودھری چرن سنگھ، ٹھاکر ہرگوند سنگھ، حافظ ابراہیم، راج رشی ٹنڈن، رفیع احمد قدوئی وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ سابق وزیر اعظم اور یوپی کے وزیر اعلیٰ رہ چکے چودھری چرن سنگھ کے ذکر کا آغاز عابد سہیل نے اس جملہ سے ہی کیا ہے کہ

> "یہ جاننے کے باوجود کہ چودھری چرن سنگھ کمیونسٹوں کے سخت مخالف بلکہ دشمن ہیں، میں کسی اتوار کو ان کے یہاں پہنچ گیا۔"(۶۳)

عابد سہیل کیا، اس وقت کے تمام نوجوان کمیونسٹ پارٹی کے اصولوں کو اپنا دین مذہب سمجھتے تھے اور اسکے نظریاتی پمفلٹ کو آسمانی کتاب۔ عابد سہیل نے جس جملے سے چودھری چرن سنگھ کے خاکے کا آغاز کیا اس سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے قلم سے اس دشمنی کا بدلہ نکال لیں گے لیکن مصنف نے کتاب کے اوراق کو جذبات کی سیاہی سے پر کرنے کے بجائے اس میں حقیقت کے رنگ بھر دئے ہیں۔ انھوں نے اس واقعہ کا ذکر کیا ہے جب چرن سنگھ کو راستے میں یہ اطلاع ملی کہ ان کا استعفیٰ منظور کرلیا گیا ہے تو انھوں نے سرکاری گاڑی کو وہیں سے واپس روانہ کر دیا اور خود بس سے میرٹھ کا سفر جاری رکھا۔ یہ کوئی عام بات نہیں تھی کیونکہ موجودہ دور میں سرکاری مراعات کو حاصل کرنے کے لئے سیاستداں ہر طرح کا جوڑ توڑ آزماتے ہیں جب کہ چودھری چرن سنگھ نے عہدہ کے ختم ہوتے ہی ساری سہولیات از خود ترک کر دیں۔ عابد سہیل کا یہ اقتباس دیکھئے جس میں سیاست، دیانتداری اور خلوص ومحبت آپس میں کس طرح مدغم نظر آتے ہیں۔

"چودھری چرن سنگھ دودھ کے دھلے نہیں تھے لیکن مغربی بنگال اتر پردیش میں وہ
اس قدر مقبول تھے کہ جنتا پارٹی حکومت کی قیادت مرار جی دیسائی کے سپرد کی گئی
تو میرٹھ اور آس پاس کے درجنوں دیہات میں ایک رات بالکل اندھیاری
رہی، کسی نے ایک دیا روشن نہیں کیا۔۔۔۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ۔ ان کی
کمیونسٹ دشمنی سے سخت متنفر ہونے کے باوجود ان سے عوامی محبت کے اس
مظاہرے نے مجھے متاثر کیا تھا۔" (۶۴)

اس خاکہ میں عابد سہیل نے آج کی "دل بدلو" سیاست کا "باوا آدام" چودھری چرن سنگھ کو ہی قرار دیا ہے ان کے نزدیک " آیا رام گیا رام" کا آغاز انھوں نے ہی کیا تھا۔

"یہ حقیقت ہے کہ ہندوستانی سیاست میں " آیا رام گیا رام" کی داغ
بیل ڈالنے والے چرن سنگھ ہی تھے" (۶۵)

سیاست میں مذہبی منافرت کی چنگاری تقسیم کے بعد سے ہی اٹھنے لگی تھی مگر ابھی رواداری اور محبت نے اس کو دبائے رکھا تھا۔ عابد سہیل نے ایک ایسے واقعے کو اپنی کتاب میں نقل کیا ہے جو تاریخ کے گوشے میں شاید ہی اب محفوظ ہو۔ خلیق الزما جو ایک اچھے لیڈر تھے مگر مسلمانوں کے نمائندے کے طور پر کانگریس نے انھیں حکومت میں شامل نہیں کیا۔ ان کی انسان دوستی اور مساویانہ روی کا اندازہ اس سے کیجئے کہ وہ برسوں ہندو اکثریت کی لکھنؤ میونسپل کمیٹی کے چیئرمین رہے تھے۔ وہ پنڈت خلیق الزماں کہلاتے تھے۔ انھوں نے امین آباد کے ہنومان مندر کا سنگ بنیاد رکھا تھا اور اپنی زیر نگرانی اسے تیار کرایا تھا جب کہ مسلمان اس تعمیر کے خلاف تھے۔ اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مندر مسجد کی سیاست اس دور میں شروع نہیں ہوئی تھی۔ لیکن ہاں اس کا آغاز عابد سہیل کی زندگی میں ہی ہوا تھا کیونکہ اسی مندر کے تذکرہ میں وہ آگے لکھتے ہیں

"بیس پچیس سال قبل تک یہ سنگ بنیاد میں نے خود دیکھا تھا۔ اب شاید نو تعمیر
عمارت میں چھپ گیا ہو یا چھپا دیا گیا ہے۔" (۶۶)

کتاب میں پنڈت نہرو کے بارے میں کسی خاص عنوان کے تحت کچھ نہیں لکھا گیا ہے اگرچہ جا بجا ان کے بارے میں بہت کچھ موجود ہے ۔ اپنی کتاب میں سیاسی جوڑ توڑ کی ایسی مثالیں اور واقعے عابد سہیل نے جمع کر دئے ہیں جو تاریخ کی دیگر کتابوں سے ملنا مشکل ہے مگر تاریخ کی کتاب اور جو یادرہا میں ایک اور بنیادی فرق یہ ہے کہ وہاں واقعات کا ترتیب وار بیان تو ملے گا مگر ایک غیر جانبدار نقطہ نظر کی کمی ضرور محسوس ہوگی۔

اس کتاب میں مصنف نے اپنی سیاسی بصیرت کو کام میں لاتے ہوئے ان گوشوں کو بھی روشن کیا ہے جس سے عام قاری سرسری طور پر گذر جاتا۔ اس کی عمدہ مثال میں کشمیر کی رائے شماری کو پیش کیا جاسکتا ہے جس میں نہرو اپنی لمبی چھٹی اور تکان کا ذکر کرتے ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ رفیع احمد قدوائی کو وہ "فرنٹ" پر لانا چاہتے ہیں۔ اس کا سبب یہ کہ اقوام متحدہ نے کشمیر الحاق کے مسئلہ کو کشمیریوں کی رائے شماری سے مشروط کر دیا تھا۔ یہاں پر مصنف اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں

> "میرا خیال ہے، بلکہ سوچی سمجھی رائے ہے، کہ پنڈت نہرو رفیع احمد قدوائی کو وزیر اعظم بنا کر کشمیر میں رائے شماری کرانا چاہتے تھے لیکن رفیع صاحب کے انتقال سے یہ باب ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا۔" (٦٧)

اس سیاسی بصیرت کے قائل ان کے اردگرد کے افراد بھی تھے۔ لہٰذا جب نیشنل ہیرالڈ اور پائنر کے درمیان میچ میں عابد سہیل نے ہیٹ ٹرک ماری اور اس میچ میں انعامات ریاستی گورنر چنا ریڈی نے تقسیم کئے تھے اور اپنی تقریر میں کہا تھا "جلد ہی مجھے بھی ایک میچ کھیلنا ہے"۔ اس جملہ پر عابد سہیل نے ہیرالڈ کے چیف رپورٹر این بہل سے کہا تھا "بہوگنا گئے"۔ اور وہی ہوا چند ماہ بعد الیکشن میں اکثریت کے باوجود بہوگنا کو استعفیٰ دینا پڑا تھا۔ اس دور اندیشی اور زود فہمی پر بہل صاحب نے عابد سہیل کی تعریف کی تھی۔

یہ کتاب خودنوشت کے تعلق سے قاری کے تقاضہ "اپنے عہد کا ذکر" کو پورا کرتی ہے۔ اور صرف سیاست کو ہی نہیں بلکہ سماج پر اثر ڈالنے والے ہر اس امر کی نشاندہی کرتی ہے جس نے سماجی وفکری تغیرات میں بڑا کردار ادا کیا ہے۔

☆ تہذیب اور قدیمی رواداری

یہ خودنوشت اورئی، بھوپال، جونپور، لکھنؤ وغیرہ کی ملی جلی اور نایاب تہذیب کی پاسبان ہے۔ خودنوشت کے آغاز ہی میں عابد سہیل نے مسلم سماج کی ایک بہترین روایت جس کو آج زمانہ بھول چکا ہے 'بسم اللہ' کا ذکر کیا ہے۔ بسم اللہ کی رسم اس وقت ادا کی جاتی ہے جب بچہ ذہنی نشونما کے دور میں قدم رکھتا ہے اور اس زمانہ کے واقعات بچہ کی تربیت میں نمایاں کردار ادا کرتے ہیں۔ اس رسم کی وجہ سے بچہ کے نرم و نازک ذہن پر جو نقش قائم ہوتا ہے وہ اسے زندگی کو خوبصورت نظریہ سے دیکھنے کا سلیقہ سکھاتا ہے شاید اسی لئے عابد سہیل کو اپنی بسم اللہ کی رسم میں سوائے اس کے کچھ بھی یاد نہیں کہ انھیں نہلا دھلا کر اپنے رب کا نام لینے کے لئے کہا گیا۔ وہ لکھتے ہیں

۔۔۔میری بسم اللہ ہوئی تھی لیکن اس تقریب کی تفصیلات یاد نہیں، علاوہ اس کے
کہ مجھے نہلا دھلا کر خوب اچھے کپڑے پہنائے گئے اور مولوی صاحب نے کئی
بار مجھ سے ''بسم اللہ'' کہلایا تھا اور سب سے پہلے مجھے مٹھائی کھلائی تھی۔'' (۶۸)

منت ماننے کا رواج ہر مذہب میں ہے اور ہر جگہ اس کی نوعیت مختلف ہے۔ مسلمان خاص طور سے اودھ کے مسلمان کسی مصیبت کے ٹل جانے یا پریشان کن مسئلہ کے حل پر نذر کا اہتمام کرتے ہیں۔ ماضی قریب میں تو نذر کے بعد ہی ہر قیمتی چیز اور موسمی پہلے پھل کا استعمال کیا جاتا تھا یہ روایت آج بھی باقی ہے لیکن اسکے پاسداروں میں اب معدودے خاندان ہی بچے ہیں۔ یہ نذر رسولخدؐا یا پھر پنجتن سے منسوب ہوتی ہے جس میں کوئی میٹھی چیز بنا کر لوگوں کو مدعو کیا جاتا ہے۔ آج اس کی نوعیت تبدیل ہو چکی ہے سب سے پہلے تو یہ مسلمانوں کے ایک فرقہ شیعہ میں محدود ہو چکی ہے (حالانکہ بعض دیگر فرقے بھی اس کا اہتمام کرتے ہیں مگر ان کی تعداد بہت کم ہو گئی ہے) اور اب نذر میں صرف شیرینی پر اکتفا نہیں ہوتا بلکہ دیگر نعمتیں بھی اس میں شامل ہو چکی ہیں، اس میں کوئی قباحت نہیں ہے، لیکن یہاں نعمتوں سے زیادہ خلوص کو اہمیت حاصل ہے۔ عابد سہیل نے اپنی کتاب میں وہ واقعہ بھی پیش کیا ہے جب ان کے والد قتل کی مسل کھو جانے کی وجہ سے پریشان تھے کیونکہ اس کے نہ ملنے پر انھیں گولی بھی ماری جا سکتی تھی۔ لیکن جلد ہی یہ مسل مل گئی اور یہ مصیبت ٹل گئی۔ اس دن شام کو عابد سہیل کے یہاں ملیحدہ بنا اور نذر دی گئی۔ اتنے عرصہ گذر جانے کے بعد بھی عابد سہیل کو یہ عمل یاد رہا جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے میں اس چھوٹے سے عمل میں کتنی روحانیت اور اہمیت تھی۔

ہندوستان بالخصوص اودھ کی تہذیب میں ایک اہم مقام محرم کے جلوس اور عید میلادالنبی کے جلسہ کو حاصل ہے۔ آزادی سے قبل اور چند سال آزادی کے بعد بھی جس اہتمام سے ان جلوس کا استقبال کیا جاتا رہا وہ اس زمانے کی زندگی کا ایک اہم حصہ بن گیا تھا۔ اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ اس عہد کی لکھی گئی اہم تصانیف میں ان دونوں (محرم اور عید میلادالنبی) ہی کا ذکر شدومد کے ساتھ ملتا ہے۔ عابد سہیل نے جس انداز سے محرم کے جلوس کا ذکر کیا ہے وہ ان کے قوی الحافظہ ہونے کی دلیل ہے ساتھ ہی یہ بھی واضح کرتا ہے کہ وہ منظر نگاری پر کتنی قدرت رکھتے ہیں، محرم کے جلوس میں شرکت کرنے والا ان کی اس تحریر کی قرأت کے بعد یہ فیصلہ نہیں کر پائے گا کہ وہ اپنی آنکھوں کی مدد سے بہتر طریقہ سے جلوس کو دیکھ سکتا ہے یا عابد سہیل کی اس تحریر کے ذریعہ! اقتباس ملاحظہ ہو

''نویں محرم کی رات میں مختلف رنگوں کے کپڑوں کی چوڑی پٹیوں کی بٹی ہوئی
ڈوریوں سے سجا سجایا رنگ برنگا تعزیہ اس پر رکھ دیا جاتا اور اگلے دن محرم کے

جلوس میں وہ سب سے آگے رہتا ورا بڑا تعزیہ کہلاتا۔ یہ تعزیہ ان لوگوں کا ہوتا جنھیں لوگ خلیفہ کہتے۔

اورئی میں تعزیہ داری کی ساری دھوم دھام اور رونق انھی کے دم قدم سے ہوتی۔ وہی خوب اونچی اونچی چھڑیں نکالتے جو رنگ برنگے کپڑوں میں لپٹی ہوتیں اور جن کے اوپر، بالکل اوپر، سبز رنگ کے کپڑوں کی دھجیوں کا ایک جھومر سا ہوتا جس کی چمکدار پتیاں جھلملاتیں۔ یہ جھومر حضرت امام حسین کی سر بلندی کی علامت ہوتا۔ یہ چھڑ بھی کمال کی چیز ہوتی۔ اسے پچیس تیس لوگ مل کر زمین سے ،جس پر دریاں بچھی ہوتی سیدھی کرتے اور پھر توازن قائم رکھنے کے لئے آنکھیں چھڑ کی اوپر کی پھننگی پر جمائے جمائے قادر میاں کے ہاتھوں کے اس کٹورے میں جو وہ اپنے ہاتھ کی دسوں انگلیاں ایک دوسرے میں کس کر بنا لیتے، رکھ دیتے۔ اس کوشش کی کامیابی پر، اور وہ ہمیشہ ہی ہوتی، نعرۂ حیدری بلند ہوتا اور کبھی کبھی نعرۂ تکبیر بھی۔ قادر میاں کی نظریں چھڑ کے بالکل اوپر کے حصے پر جمی رہتیں اور اور وہ اپنے قدموں کو آگے پیچھے، دائیں بائیں کر کے اس کا توازن قائم رکھتے اور جلوس میں سب سے آگے لیکن تعزیوں کے پیچھے رہتے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد جلوس رک جاتا اور وہ اپنے جسم کو سنبھالتے، دو قدم آگے بڑھتے، دو قدم پیچھے ہوتے، ایک آدھ قدم دائیں بائیں ہوتے اور بجلی کی تیزی سے جھک کر جانے کیسے چھڑ کو کندھے پر منتقل کر دیتے۔'' (۶۹)

محرم کا یہ جلوس غمی کے اظہار کے ساتھ ساتھ مشترکہ تہذیب کی ایک قوی علامت ہے تمام عقید تمندان اس میں اس طرح شامل ہوتے کہ فرق نہیں کیا جا سکتا تھا کہ کون ہندو ہے کون مسلمان؟ کون شیعہ ہے اور کون سنی؟ کچھ تو اس وجہ سے بھی شامل ہوتے کہ یہ ان کی زمین سے جڑی رسم تھی اور اس طرح غم کی اس فضا میں بھی 'سب کے ساتھ' ہونے کا احساس ایک عجب طرح کی مسرت پیدا کر دیتا۔ جس کا اندازہ اس اقتباس سے ملاحظہ کیجئے

''برقع پوش مسلم خواتین اور وہ جو برقع نہ پہنے ہوتیں اور ان سے زیادہ ہندو عورتیں جو چادر سے اپنے سروں کو ڈھکے رہتیں، سڑک کے کنارے مکانوں کے چبوتروں، کھڑکیوں دروازوں اور چھجوں سے یہ جلوس دیکھتیں اور آگے بڑھ کر

نہایت عقیدت اور احترام کے ساتھ تعزیوں اور چھڑوں کو بے حد آہستگی سے
چھوتیں اور ہاتھ اپنے چہروں پر پھیر لیتیں۔

عشرے کے دن شہر کے تقریباً سارے مسلمانوں اور سکڑوں ہندوؤں کے
گھروں میں تعزیے ٹھنڈے کیئے جانے کے بعد ہی کھانا پکتا، اور بہت سے
گھروں میں کھچڑا جو بے سروسامانی کی علامت ہوتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ میرے
دوست شیام سندر شرما کے والد جو برہمن تھے اور پیشے سے وید، سبز کرتا، سبز ٹوپی
اور سفید پے جامہ پہنے جلوس کی اگلی صفوں میں ہوتے اور ایسا لگتا کہ ان کا ہاتھ
سینے سے چپک گیا ہو۔۔۔۔درجنوں مجلسوں اور میلادوں میں اماں کے ساتھ
شریک ہونے کے باوجود شیعہ۔سنی اختلافات سے بالکل ناواقف تھا اور
اختلافات کی شدت اور ان کی پروردہ لعنتوں کو لکھنوٗ منتقل ہونے کے بعد ہی
جان سکا اور وہ بھی بس ایک حد تک۔''(۷۰)

عابد سہیل نے عید میلاد النبی کا تذکرہ بھی اتنی ہی تفصیل سے کیا ہے جتنا کہ محرم کا اور شاید اس کی ایک وجہ یہ ہو
کہ ان دونوں پروگرام میں جو یکجہتی اور انسانی محبت کا احساس ملتا ہے وہ کسی اور میں نہیں۔ اسی وجہ سے عابد سہیل ان
دونوں تحریروں میں 'ہندو۔مسلم' الفاظ پر قلم کی روشنائی زیادہ استعمال کرتے ہیں اور پڑھتے وقت بھی یہ محسوس ہوتا
کہ خودنوشت نگار کا منشا ہے کہ ان الفاظ کو زور دے کر پڑھا جائے اقتباس ملاحظہ ہو

''سبزی منڈی میں جہاں تخت پر بانس کی بنی ہوئی درجنوں دوکانیں تھیں بارہ
وفات کے موقع پر عید میلاد النبی کا اہتمام کیا گیا تھا۔ سبزی فروشوں نے جن میں
ہندو مسلمان سب شامل تھے اس دن دوکانیں نہیں لگائی تھیں۔۔۔۔۔میلاد
شروع ہونے سے پہلے ہی میدان سامعین سے چھلکا پڑ رہا تھا۔ میرا خیال ہے
ان میں ہندوؤں کی تعداد کافی رہی ہوگی۔''(۷۱)

عابد سہیل نے قادر الکلامی کا استعمال کرتے ہوئے عید میلاد النبی کے احترام اور روحانی جذبے کو الفاظ میں
ڈھال دیا جس کا صرف احساس کیا جا سکتا ہے۔ یہ چند الفاظ دیکھیں جو غیر مرئی جذبہ کا مشاہدہ کراتے ہیں۔

''نعرۂ تکبیر بلند ہوا اور مولانا وارثی تقریر کرنے کھڑے ہوئے تو مجمع میں ایک
ایسی سرسراہٹ پیدا ہوئی جیسے کسی نے طویل وعریض حریری چادر، ایک کونے

> سے دوسرے کونے تک، بیک وقت ہزاروں سروں پر تیزی سے کھینچ دی ہو۔
> اس سرسراہٹ میں عقیدت واحترام کی ایسی آوازیں بھی شامل تھیں جن کی تشکیل
> شاید بامعنی الفاظ سے نہیں ہوتی تھیں۔‘‘(۷۲)

بسم اللہ، محرم اور عید میلاد النبی کے علاوہ مسلم سماج کا ایک پروگرام عید الفطر ہے جس کو ہر مسلم بڑے دھوم سے مناتا ہے۔ عابد سہیل نے بھی اس دن کا بے صبری سے انتظار کیا ہوگا جیسا کہ ہر مسلمان بچے کو ہوتا ہے اور اس کی یادیں ان کے ذہن میں موجود بھی ہونگی۔ مگر اس کے باوجود ہمیں ان کی خودنوشت میں اس کا ذکر نہیں ملتا بلکہ عید قربان کا ذکر ملتا ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ خودنوشت نگار کا مقصد صرف پروگراموں کی یادداشت بیان کرنا نہیں تھا بلکہ ان واقعات کو پیش کرنا تھا جس سے قاری کو تہذیبی روایت کے ساتھ ساتھ قومی یکجہتی کا بھی درس ملے جو ہمارے سماج کو بہتر بنانے میں معاون ہو۔ عید قربان کے ذکر میں عابد سہیل نے برادر وطن کی آستھاؤں اور جذبات کے احترام کو کس طرح اجاگر کیا اس کو ملاحظہ کیجئے

> ’’دادے ابا کے انتقال کے بعد پہلی عید قربان آئی تو گائے خرید کر حسب معمول
> قصائی کے حوالے کر دی۔ ان دنوں گئوکشی پر پابندی نہیں تھی لیکن اس خیال سے
> کہ برادران وطن کے جذبات کو ٹھیس نہ پہنچے ہمارے یہاں قربانی کا جانور چاند
> رات میں بارہ ایک بجے قصائی لے کر آتا اور راستہ بھی ایسا چنا جاتا جس میں اہل
> ہنود کی آبادی کم سے کم ہو۔‘‘(۷۳)

اسی کے ساتھ جب گائے کو پکی سڑک سے لے جایا جاتا جہاں چند گھر اہل ہنود کے ہوتے تو اس کے کھروں پر روئی کس کے باندھ دی جاتی تا کہ چلتے وقت آواز پیدا نہ ہو۔ عابد سہیل نے عید قربان کے اس ذکر کو شاید اسی لئے اپنی خودنوشت میں جگہ دی کہ یہ انسان دوستی کی ایک عمدہ مثال ہے جہاں شریعت کی پابندی کے ساتھ ساتھ آستھاؤں کی پاسداری بھی ہے۔

عابد سہیل کی اس خودنوشت میں تہذیبی مرقع کی تابانی نہایت دلکش ہے جس کی روشنی آج کے عہد میں مدھم نظر آرہی ہے۔ محرم اور جلوس وغیرہ کا ذکر دیگر کتب میں بھی ملتا ہے لیکن اس کتاب میں اودھ کا علاقائی رنگ موجود ہے جو ان واقعات کو جداگانہ طرز عطا کر رہا ہے اور ان کی اہمیت میں اضافہ بھی۔ یہ کتاب ان تہذیب کو ہمیشہ محفوظ رکھے گی۔

آج کے دور میں پرانی تہذیبوں کے علاوہ قدیم احترام ورواداری کا طرز بھی رخصت ہو رہا ہے۔ یہ کتاب اپنے اندر بعض ایسے احترامات کو سمیٹے ہوئے جن کی قرات نم دیدہ بھی کرتی ہے اور حیرت زدہ بھی۔ ایسا شاید اس

لئے کہ آج کا قاری ایسے ماحول سے بالکل ناواقف ہے جہاں گھر کے ملازمین ایک فرد کی حیثیت رکھتے ہوں۔ آج سوسائٹی میں اگر نوکرانی داخلی معاملات میں ایک لفظ بول دے تو شاید اپنی نوکری سے ہاتھ دھو بیٹھے، برخلاف اس دور کے جب عابد سہیل کے یہاں کام کرنے والی ملازمہ منیر کی اماں کی حیثیت ایک ملازمہ کی نہیں بلکہ اہل خانہ کی تھی۔ حیرت ہوتی ہے کہ جب عابد سہیل کے والد نے ایک بار انھیں چانٹا مارا تو منیر کی اماں کرچھے سمیت ان کے والد کے سامنے آگئیں اور کرچھا تان کر کہا

"بس ظفریاب بس اب ہاتھ نہ اٹھے"

یہ جملہ نہیں بلکہ نصف صدی قبل کے آداب اور احترام کا آئینہ ہے جس میں آج کا ترقی یافتہ اور "وِل ایجوکیٹڈ" سماج اپنی متغیر و مبتذل صورت دیکھ سکتا ہے۔ اس وقت کے اس جملہ پر عابد سہیل کے والد کا ردعمل صرف اتنا تھا کہ وہ سر جھکا کے وہاں سے چلے گئے۔ لیکن آج یہ الفاظ قیامت ڈھانے کے لئے کافی ہیں۔ اسی طرح وہ دوکاندار بھی قابل ذکر ہے جو مصنف کو بالکل نہیں جانتا اور روپئے نہ ہونے کے باوجود گراموفون لے جانے کے لئے پیک کرا دیتا ہے تعجب اس بات پر ہے کہ نہ عابد سہیل کا پتہ پوچھتا ہے اور نہ ہی ضمانت کے طور پر کچھ گروی رکھوا تھا ہے بلکہ کچھ روز بعد جب ان سے بل مانگنے عابد سہیل پہنچے تو نہایت فراخ دلی سے کہا

"جلدی کیا ہے اخبار کھل جانے دیجئے اس کے بعد بل بھی دے دیا جائے گا۔" (۷۴)

یہ ادب اور احترام صرف ایک دو گھر میں نہیں تھا بلکہ اس وقت کے ماحول اور فضا میں رچا بسا تھا۔ ہاں عابد سہیل کے یہاں اس میں زیادتی ضرور تھی۔ خود مصنف نے اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"ان دنوں شرفا میں حدِ ادب کے سلسلے دراز ہوتے لیکن ہمارے گھر میں تو حالات انتہاؤں پر تھے۔ میں نے ابا کو دادے ابّا سے بات کرتے کبھی نہیں دیکھا۔ وہ دادے ابا کو دیکھتے ہی سر جھکا لیتے اور ذرا سا ہٹ کر نکل جاتے۔" (۷۵)

بقول مصنف ان کے والد اور دادا میں گفتگو دادی اماں یا خود عابد سہیل کے ذریعہ خط و کتابت کے توسط سے ہوتی تھی۔ بچپن سے اس ماحول نے عابد سہیل کے نزدیک تہذیب اور احترام کا ایک دائرہ کھینچ دیا تھا جس کے باہر انھوں نے کبھی قدم نہیں رکھا۔ یہی وجہ رہی کہ اپنے دوستوں میں بھی وہ لئے دئے رہتے۔

☆ صداقت وراست گوئی

سماج میں صداقت پسند انسان جتنے زیادہ ہیں، اتنی ہی کم تعداد صدق گو افراد کی ہے۔ یہ منزل اتنی سخت ہے کہ یہاں "سورمائے سخن دراز" بھی سپر انداخت نظر آتے ہیں۔ کوئی خودنوشت اس منزل سے گزرے بغیر کامیاب نہیں ہوسکتی ہے۔ "جو یاد رہا" بھی اس منزل سے گزری ہے اور عابد سہیل نے اس سخت سفر میں کہیں بھی صدق گوئی سے انحراف نہیں برتا۔ یہاں تک کے وہ خیال بھی لکھ ڈالا جس پر زندگی بھر پشیمانی محسوس کرتے رہے۔ وہ لکھتے ہیں

"دو تین دن بعد ابا کی شدید علالت کا تار آیا تو منیر کی اماں پھوٹ پھوٹ کے رونے لگیں۔ اس طرح کے تار کا مطلب کچھ اور ہی ہوتا تھا۔ رویا میں بھی تھا لیکن غم کی دبیز چادر نے مجھے اس طرح نہیں لپیٹا تھا جیسے وہ بعد کی تقریباً ساری زندگی لپیٹے رہی۔ نہ صرف یہ بلکہ ایک طرح کے سکون، بلکہ معمولی سی مسرت کا احساس بھی ہوا تھا کہ اب کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں۔

بعد کی ساری زندگی جس طرح گذاری اور دنیا نے جیسا کچھ سلوک کیا اس کے لئے میں نے خود کو ہمیشہ اس وقت کی معمولی سی مسرت کی اپنی کمینگی سے جوڑ کے دیکھا ہے۔" (٧٦)

یہ بے باکی عابد سہیل کی صرف اپنی حد تک محدود نہیں تھی بلکہ وہ حقیقت بیانی میں عزیزداری کے قائل نہیں تھے۔ انھوں نے جیسا ٹھیک سمجھا اسے بیان کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔ یہاں پر اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے چلیں جب عابد سہیل بھوپال میں اپنے حشمت پھوپا کے یہاں رہتے تھے۔ عابد سہیل کے والد نے وہاں ایک شریف خاندان کی مدد کی تھی جس پر وہ خاندان بطور معاوضہ ایک رقم حشمت پھوپھا کے یہاں بھیج دیا کرتا تھا مگر یہ رقم بعض سبب کی بنا پر عابد سہیل کے گھر نہیں پہنچ پائی۔ ایک دن عابد سہیل کے والد نے خط لکھ کر اس خاندان سے کرایہ دینے کے لئے منع کر دیا اور حشمت پھوپھا اور عابد سہیل کے والد کے درمیان گرہ پڑ گئی۔ یہاں مصنف نے لکھا

"یہاں ابا سے غلطی ضرور ہوئی۔ انھیں یہ کام پھوپا کو مطلع کئے بغیر بالا بالا (ہلا بھلا) نہیں کرنا چاہئے تھا۔ پھوپا نے اس بات کا برا مانا اور اس پر وہ حق بجانب تھے۔" (٧٧)

یہ جرأت اظہار مصنف کی پوری کتاب میں دیکھنے کو ملے گی اور سب سے زیادہ ان کی ذات سے متعلق۔ عابد سہیل نے خود انکشافی میں پردہ پوشی سے کام نہیں لیا۔ بچپن سے لے کر جوانی اور پھر عمر کی آخری منزلوں کا ذکر بھی بڑی خندہ پیشانی سے کیا ہے۔ کئی مقامات پر صحیح ہونے کے باوجود انھیں صرف اس لئے افسوس ہوا کہ انھوں نے احترام کی حدود کا خیال نہیں رکھا تھا۔ ہیرالڈ کے پی سی ٹنڈن جنھوں نے عابد سہیل کے کمیونسٹ ہونے پر طنز کیا جس کا جواب انھوں نے بھی طنزیہ مگر سخت انداز میں دیا دفتر کے سب لوگ تو خوب ہنسے لیکن عابد سہیل ان کی بزرگی خیال کرنے کے بعد ضرو پشیمان ہوئے۔ یہ پشیمانی ان کے دل میں کتاب لکھنے کے وقت تک باقی تھی اور شاید یہ جملہ لکھ کر

"سچ پوچھیے تو مجھے اپنے ردعمل پر افسوس تھا" (۷۸)

انھوں نے اس پشیمانی کو کم کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ اعتراف بھی بڑے دل والے ہی کر پاتے ہیں۔ خودنوشت میں بہت سے ایسے مقامات ہیں جہاں عابد سہیل نے اسی طرح کے اقعات درج کئے ہیں۔ مثلاً جب محمد حسن اردو اکادمی کے چیئر مین بنے تو لوگوں نے اپنی کتابوں پر انعام کے لئے عابد سہیل کے ذریعہ محمد حسن تک سفارشات پہچانا شروع کر دیں۔ عابد سہیل نے باقی سب کو تو ٹال دیا لیکن ایک صاحب جو کافی منع کرنے کے بعد بھی بضدر رہے کہ آپ میری کتاب کے لئے محمد حسن سے سفارش کر دیں آخر میں عاجز آ کر عابد سہیل نے دروغ مصلحت آمیز سے کام لیتے ہوئے ان سے بتا دیا کہ میں نے اشارتاً محمد حسن سے کہہ دیا ہے جس پر وہ بہت خوش ہو گئے۔ اتفاق سے انھیں انعام بھی مل گیا جس کے وہ بجا طور پر مستحق تھے۔ اس جگہ پر اکثر لوگ اپنی واہ واہی بٹورنے کے لئے سچ بات بیان نہیں کرتے اور کامیابی کا صحرا اپنے سر باندھ لیتے ہیں۔ لیکن عابد سہیل نے یہاں بھی اس بات کا بجا طور پر اعلان کیا کہ یہ انعام کتاب کی قدر و قیمت پر ملا تھا ان کی سفارش پر نہیں۔ وہ لکھتے ہیں

> "انعامات کا اعلان ہوا تو ان کے شعری مجموعے کو اچھا خاصا بڑا انعام ملا جس کا وہ بجا طور پر مستحق تھا۔۔۔ میں خوش تھا کہ حق بہ حقدار رسید لیکن ایک غم بھی تھا اور وہ اس خوشی سے بڑا تھا کہ میری مروّت، کمزوری اور جرأت انکار کی کمی سے ایک شاعر اپنے شعری مجموعے کی قدردانی پر بجا طور پر خوش ہونے سے محروم رہ گیا۔ اس کے دل میں تو یہ کانٹا ہر دم کھٹکتا رہے گا ہی کہ یہ ثمرۂ خوبی نہیں ثمرۂ سفارش ہے۔" (۷۹)

اس اندراج سے کتاب کی فضا فطری معلوم ہوتی ہے۔ احساس ہوتا ہے کہ ان اوراق میں ایک زندگی ہے جو اپنی خوبیوں اور کمیوں کے ساتھ پروان چڑھ رہی ہے۔

☆ اردو زبان

عابد سہیل کے والد کو ہائی اسکول کے بعد سرکاری ملازمت مل گئی تھی۔اس دور کی تعلیمی دستور کے مطابق انھیں اردو اور فارسی سے واقفیت ضرور تھی لیکن ادبی سرگرمیوں سے دلچسپی بس اتنی تھی کہ سالانہ ہاکی ٹورنامنٹ کے موقع پر مشاعرہ کراتے تھے۔ دادے ابا کو بھی اردو شعروادب سے کچھ خاص لگاؤ نہیں تھا۔البتہ ان کے نانیہال میں "عصمت" جیسے ادبی پرچے ضرور آتے تھے اس لئے ان کی والدہ شعروادب سے ناواقف نہیں تھیں۔ اگر چہ عابد سہیل نے کہیں پر بھی اپنی والدہ کے ادبی مذاق کا تذکرہ نہیں کیا ہے۔بس اتنا لکھا ہے

> "جونپور میں ہمارا ننا یہالی مکان خانقاہ رشیدیہ سے ملحق بلکہ ایک طرح سے اس کا ایک حصہ ہے۔اس مکان کی کئی الماریوں اور طاقتوں میں کتابوں کی موجودگی مجھے اچھی طرح یاد ہے۔شاید اسی سبب اماں کو مطالعہ کا شوق تھا، خاص طور سے ان کتابوں اور رسائل کا جو خواتین سے متعلق ہوں۔" (۸۰)

عابد سہیل کے والد اپنے لئے "مدینہ" رسالہ منگاتے تھے اور اسی ادارہ سے بچوں کے لئے شائع ہونے والا پرچہ "غنچہ" عابد سہیل کے لئے آتا تھا۔ادب کا یہ کمزور سا پودھا جس کی آبیاری کا انتظام اورئی میں تقریباً مفقود تھا لکھنؤ آنے کے بعد سے نشوونما پانے لگا،اس کے دو اسباب ہیں ایک تو ادب کی طرف عابد سہیل کا فطری رجحان اور دوسرا ان کی مالی حالت، جس نے انھیں رسالوں وغیرہ میں لکھنے کے لئے آمادہ کیا اور ریڈیو کے پروگرامز وغیرہ تیار کرنے کی طرف تشویق دلائی۔ لکھنے پڑھنے کا یہ شوق ان کے ساتھ آخر عمر تک تازہ دم رہا۔جس کا بیّن ثبوت اس کتاب (جو یاد رہا) کا وجود ہے۔ یہ خودنوشت تقریباً ساٹھ سالہ ادب کے ان واقعات کو سمیٹے ہوئے ہے جن کو پڑھ کر قاری کو ادبی ترقی وتغیرات کا علم ہوتا ہے۔اس میں وہ باتیں بھی ہیں جو مخلصین اردو کے لئے قابل افسوس ودلسوز ہیں۔اردو وفد کا مرکزی وزیر تعلیم سے ملاقات کا واقعہ اس ضمن میں کافی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ ملاقات 14 نومبر 1986 کو ہوئی تھی۔ سبب یہ تھا مرکز کی جانب سے تمام ریاستوں میں "نو اودے کالج" کھولے گئے تھے۔ اتر پردیش میں کالج کا قیام تو عمل میں آیا لیکن یہاں اردو کا کوئی ذکر نہیں تھا۔اس رویہ سے خفا ہو کر اردو اکادمی اتر پردیش نے ایک میٹنگ کی جس میں مرکزی وزیر تعلیم سے ملاقات کر میمورنڈم پیش کرنے کی تجویز عابد سہیل نے پیش کی۔محمود الٰہی کی قیادت میں یہ وفد دہلی کے لئے روانہ ہوا اور عابد سہیل اپنی کمیٹی کی مدت کار ختم ہونے کے باوجود اس میں شامل رہے۔ یہ وفد اردو کی تعلیم وترویج کے ارادے کے ساتھ مرکزی وزیر کے کیبن میں داخل تو ضرور ہوا لیکن وزیر کے سامنے اصل مقصد کی حیثیت ثانوی ہوگئی اور لوگ اپنی ملاقاتیں اور قرابتیں یاد دلانے

لگے۔ جب اصل مقصد کا ذکر آیا تو وزیر تعلیم نرسمہا راؤ نے ایک زیرک سیاست داں کی طرح کہا "مجھے مولوی صاحب رکھ کر اردو پڑھائی جاتی تھی جب کہ مردم شماری کے کاغذات میں میری مادری زبان اردو لکھی تھی۔" یہ بات نرسمہا راؤ نے میمورنڈم میں ذکر کی گئی اس بڑی آبادی پر کہی تھی جس کی مادری زبان اردو بتائی گئی تھی۔ آگے کی کارروائی عابد سہیل کی زبانی ملاحظہ فرمائیں

"مجھے نرسمہا راؤ کی یہ بات، بہت بری لگی لیکن اس سے زیادہ افسوس ہوا اس پر کہ وفد کے سینئر اراکین میں سے کسی نے اس کا جواب دینے کے بجائے مسکراتے رہنے کو ہی کافی سمجھا۔ میں نے خود پر قابو پایا اور وزیر با تدبیر سے "عرض" کیا کہ مادری زبان کے معنی ہیں بچے کی ماں کی زبان اور آپ کی والدہ اردو بولتی ہوں گی اس لئے آپ کی مادری زبان اردو سمجھی گئی۔ بچے کی مادری زبان کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ وہ ماں کے پیٹ سے عالم و فاضل بن کر پیدا ہوتا ہے۔ خود اتر پردیش میں جہاں کی سرکاری زبان ہندی ہے، ان طالب علموں کو جن کی مادری زبان ہندی بتائی جاتی ہے، کلاس روم میں جل کے معنی پانی اور وایو کے معنی ہوا بتائے جاتے ہیں۔"(۸۱)

عابد سہیل کے جواب پر وہ قائل ہو گئے اور وعدہ کیا کہ اگر میں دو مہینہ بھی اس عہدے پر رہا تو اردو کی تعلیم کی فراہمی یقینی بنا دوں گا۔ اور ایسا ہی ہوا۔ لیکن یہاں پر ان افراد کے رویہ پر افسوس بھی ہوتا جو اردو کی "دکھاوی محبت" کا لباس زیب تن کئے واہ واہی وصول کرتے۔ ایسے افراد صرف اُس زمانے میں ہی نہیں تھے بلکہ موجودہ دور میں بھی بقائے اردو کی جنگ میں "مٹی کے شیر" لاتعداد مل جائیں گے۔ اُس وقت بھی وفد کے کچھ ممبر وزیر کے کیبن سے باہر آنے کے بعد عابد سہیل پر برس پڑے اور کہا کہ وزیر تعلیم سے اس طرح بات کی جاتی ہے۔ اگر وہ ہم لوگوں کو باہر نکال دیتا تو۔۔ عابد سہیل نے جواب دیا کہ ہم لوگ باہر آ جاتے لیکن یہ سمجھ لئے کہ اگر ان کالجز میں اردو کا انتظام ہوا تو وہ اسی انداز کا مرہون منت ہو گا۔

عابد سہیل کے دل میں اردو کی سچی محبت تھی اور وہ اس زبان کے ساتھ ہونے والے سوتیلے رویہ سے غمزدہ بھی تھے۔ انھوں نے نصرت پبلشر اور ادبی رسالہ "کتاب" نکال کر "اپنے حصہ" کی "شمع روشن" کر دی تھی اور 13 سال تک یہ شمع روشن بھی رہی لیکن رسالوں کی عدم دلچسپی یا یوں کہئے کہ اردو والوں کی بے توجہی کے تھپیڑوں میں یہ چراغ بھی گل ہو گیا۔ حالانکہ رسالہ "کتاب" کو باقی رکھنے کے لئے ایک میٹنگ بھی کی گئی تھی۔ لیکن میٹنگ میں شامل لوگوں

نے خیالی منصوبوں کے ذریعہ اسے خوب خوب فروغ دیا اور آخر میں رسالہ کی ممبر شپ لئے بناوہاں سے چلے گئے۔ عابد سہیل نے ایسے بہت تجربے کئے تھے اور انھیں اس تنزلی پر بہت افسوس تھا۔ اسی لئے انھوں نے اپنی خودنوشت میں ایسے حادثات کو درج کر دیا ہے۔ یہ دو واقعات ملاحظہ کیجئے جو اردو کی زبوں حالی بیان کرتے ہیں۔

ایک دن عابد سہیل کے شناسا نصرت پبلشر ایک کتاب عاریتاً لینے آئے جو اصل میں انھیں نہیں بلکہ ان کے دوست کو چاہئے تھی کیونکہ ان کے دوست کو ریڈیو ٹاک دینی تھی۔ عابد سہیل نے ان صاحب کا ذکر سننے کے بعد کہا وہ تو صاحب حیثیت ہیں اور انھیں ریڈیو سے معاوضہ بھی ملے گا پھر بھی وہ یہ ساڑھے نو روپئے کی کتاب عاریتاً منگا رہے ہیں۔ یہ سن کر وہ صاحب کتاب رکھ کر واپس چلے گئے اور اگلے دن وہ کتاب ایک نامعلوم شخص خرید لے گیا۔

اسی طرح ایک دن ایک خاتون ان سے "آگ کا دریا" بطور کرائے پر لے جانے کی درخواست کرنے لگیں۔ عابد سہیل نے جب انکار کیا تو وہ بولیں کسی کو معلوم ہی نہیں ہوگا کہ کوئی کتاب لے گیا تھا۔ اس پر عابد سہیل نے کہا

"معاملہ معلوم ہونے کا نہیں۔ اصل میں کتاب کے پہلے قاری کو Untouched۔۔۔"

اتنا کہنے پر وہ خاتون بھڑک گئیں اور کہا آپ کو خواتین سے بات کرنے کی تمیز نہیں ہے۔ ان کے لاکھ اصرار پر بھی عابد سہیل نے کتاب کرائے پر نہیں دی اور وہ اپنی کار میں بیٹھ کر واپس چلی گئیں۔ یہاں بھی اگلے روز وہ کتاب ایک نامعلوم شخص خرید لے گئے۔

یہ دونوں واقعات بتاتے ہیں کہ اردو زبان کی زبوں حالی کا ذمہ دار کون ہے اور اسے ایک پیشہ ورانہ یا روزگار کا ذریعہ بنان کیوں ناممکن سا ہے؟ اردو داں طبقے کے اس رویے سے کاروبار نقصان میں رہا کیونکہ اپنے لوگوں نے اسے اہمیت نہیں دی۔ بقول مصنف

"اہل زبان کو سیکھنا کیا اردو گھر کی لونڈی ہے، گھر کی لونڈی کو منہ نہیں لگایا جاتا۔"(۸۲)

اس ناقدری کے سبب ہی نصرت پبلشر کو بند کرنے کی نوبت آئی۔ نصرت پبلشرز کو بند کرنے سے پہلے عابد سہیل نے تمام لوگوں کا ایک ایک روپیہ ادا کر دیا تھا حالانکہ نصرت پبلشرز کے تقریباً ایک لاکھ روپئے دوسروں پر بقایا تھے۔ کتب فروشی کے کاروبار میں عابد سہیل کو جو تجربے ہوئے ان پر افسوس بھی ہوتا ہے اور حیرانی بھی۔ انھوں نے لوگوں کو چپکے سے رسالے چراتے ہوئے دیکھا تھا اور صرف یہ سوچ کر خاموش رہتے کہ ہوسکتا ہے اسی طرح پڑھنے کا شوق پیدا ہو جائے۔ ان کا رویہ طلبہ کے ساتھ بہت ہمدردانہ اور مخلص تھا وہ کتابیں وی پی کے ذریعہ بھیجنے کے بجائے سادی ڈاک سے بھیجتے تا کہ طلبہ کو ڈھائی روپئے کی کتاب سات آٹھ روپئے کی نہ پڑے۔ یہ خطرہ وہ اپنے کاروبار پر مول لیتے کیونکہ سادی ڈاک کے ساتھ وہ ایک تحریر بھی پوسٹ کر دیتے تھے کہ اگر کتاب مل جائے

تو قیمت منی آرڈر کر دیجئے گا ورنہ کوئی بات نہیں۔تقریباً نوے فیصد قیمت انھیں مل جاتی۔ باقی کے بارے میں وہ یہی تصور کرتے کہ وہ ڈاک کی بدانتظامی کا شکار ہو گئے۔اس کے علاوہ طالب علموں بالخصوص طالبات کو دوکان میں بیٹھ کر نوٹس بنانے پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ اس دوران اگر کوئی دوست آجائے تو وہ کتاب گھر لے جانے کی بھی اجازت دے دیتے تھے۔عابد سہیل اردو کے سچے عاشق تھے اسی لئے ان کی ہمدردی ہمیشہ ان طلبہ کے ساتھ رہی جو مستقبل میں اردو کے افسانہ نگار،شاعر اور تنقید نگار بننے والے تھے۔ان کا یہ رویہ دیکھئے جس میں طلبہ اور اساتذہ دونوں کے بارے میں کتنا منصفانہ انداز اختیار کیا ہے۔

> ”۔۔۔ایک بار بھی ایسا نہ ہوا کہ کوئی کتاب واپس نہ آئی ہو۔لیکن ہزار روپے کی تنخواہ پانے والے اساتذہ دوکان میں بیٹھ کے پرچے بناتے یا کتابیں عاریتاً لے جاتے تو اچھا نہ لگتا،اگر چہ انکار نہ کرتا۔“(۸۳)

عابد سہیل نے ان لوگوں کے بارے میں بھی لکھا ہے جو صاحب حیثیت ہونے کے باوجود کتابیں خریدنے میں بخل سے کام لیتے تھے یا پھر ناجائز طور پر اسے حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ایک دفعہ انیس (عابد سہیل کی اہلیہ) دوکان پر تھیں کہ عابد سہیل کے ایک شناساں ایک خاتون کے ساتھ دوکان پر آئے، وہ جب واپس چلے گئے تو عابد سہیل کی اہلیہ کو کچھ کتابیں کم محسوس ہوئیں۔ یہ کتابیں ان کے ساتھ آنے والی خاتون کے پاس سے نکلیں۔ جو صاحب ساتھ میں آئے تھے وہ عابد سہیل کے کلاس فیلو اور رشتہ دار ہونے کے علاوہ ڈگری کالج میں اردو کے لکچرر بھی تھے۔

اردو کی زبوں حالی کے لئے حکومت کے ساتھ ساتھ وہ لوگ بھی ذمہ دار ہیں جنھوں نے اردو کا دم بھرنے کے باوجود اس زبان کے ساتھ سوتیلے رویہ کا سلوک کیا۔ یہ خودنوشت کی خاصیت ہے کہ اس میں وہ باتیں بڑی بے باکی سے شامل کر دی گئیں ہیں ساتھ ہی حفظ مراتب کا بہر خیال بھی رکھا گیا ہے۔مصنف کا یہ انداز دیکھئے جہاں کرداروں کی پردہ پوشی کے ساتھ کہانی بیان کر دی ہے۔

> ”ایک یونیورسٹی پر پندرہ بیس ہزار روپئے باقی تھے جو سابق اور نئے صدر شعبہ کے جھگڑے کی نذر ہو گئے اور بنگال کے ایک ادیب نے جو اَب پروفیسر بھی ہو گئے ہوں گے، کتابوں کی دس بارہ ہزار کی رقم خود ہی وصول کر لی۔ ان کا نام مشرقی یوپی کے ایک بہت بڑے عالم اور ادیب کے نام پر ہے۔“(۸۴)

یہاں پر محمد حسن کا ذکر کر دینا بھی ضروری ہے تاکہ توازن برقرار رہے۔محمد حسن جب اتر پردیش اردو اکادمی

کے چیئر مین مقرر ہوئے تو انھوں نے اردو کے مسائل کے سلسلہ میں جے پرکاش نرائن سے ملاقات کی اور اپنے مطالبات پر انھیں راضی کرلیا۔اس وقت ریاست میں جنتا پارٹی کی حکومت تھی۔ طے یہ ہوا تھا کہ حکومت ،محکمہ تعلیم اوراردو اکادمی کے ایک ایک نمائندے پر مشتمل کمیٹی ان تمام اسکولوں اور کالجوں کا معانہ کر کے جہاں اردو کی تعلیم کی سہولت نہیں ہے لیکن اردو پڑھنے والے موجود ہیں ، اردو ٹیچر کی تقرری کا اسی وقت فیصلہ کرے۔حکومت اس فیصلے کو ماننے کی پابند ہوگی۔سارے کام تو ہو گئے لیکن محمد حسن کی لاکھ کوششوں کے باوجود حکومت نے اپنا نمائندہ ہی مقرر نہیں کیا۔ایک سچے اردو کی عاشق کی طرح محمد حسن نے عہدہ کو اہمیت نہیں دی بلکہ بطور احتجاج چیئر مین شپ سے استعفیٰ دے دیا۔اس بات کا تصور کرنا بھی موجودہ دور میں محال ہے۔اسی طرح عابد سہیل نے بھی اپنی کتاب پر ملنے والے انعام کو صرف اس لئے واپس کر دیا تھا کہ ان کی نظر میں علی جواد زیدی کی کتاب جس انعام کی مستحق تھی انھیں اس سے کہیں کم انعام دیا گیا تھا۔

یہ کتاب صرف عابد سہیل کی آپ بیتی نہیں بلکہ اردو پر جو بیتی اس کی داستان گو بھی ہے۔ان صفحات میں ”احوال زبان“ کی کروٹوں کا جائزہ بیدار مغز اور بے باکی کے ساتھ لیا گیا ہے جس کی قرات قاری کو بہت کچھ باور کراتی ہے۔

☆ انداز بیان

ایسی خودنوشت کبھی کامیاب نہیں ہوتی جس میں انداز بیان پر توجہ دئے بغیر صرف زندگی کے واقعات رقم کر دئے گئے ہوں۔اس کی مثال روزمرہ کے اخبار سے ہی لے لیجئے۔اتنے صفحات میں ہر انسان اپنے مطلب کی خبر تلاش کرتا اور پڑھتا ہے پورا اخبار پڑھنے میں اسے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ایسا اس لئے کہ وہاں ادب کی چاشنی اور بیان کی پرکاری نہیں ہے۔اگر ایسا ہی خشک انداز ادب کی ضخیم کتابوں میں اختیار کیا جائے تو قاری کا شوق مطالعہ چند صفحات کے بعد ہی دم توڑ دے گا۔اسی لئے ادب میں انداز بیان کو تخلیقات کی مقبولیت کا ضامن سمجھا جاتا ہے۔نثری اصناف میں خصوصیت کے ساتھ خودنوشت میں قاری کی دلچسپی کو باقی رکھنے میں منظر نگاری بہت مدد و معاون ثابت ہوتی ہے۔ پڑھنے والا جیسے جیسے زمانہ گزشتہ سے آشنا ہوتا ہے اسکے اندر اس دور کے رہن سہن، کھان پان، شاہراہوں وعمارتوں وغیرہ کے مشاہدہ کی امنگ بھی اٹھنے لگتی ہے۔اس احساس تشنگی کی تسکین کے لئے منظر نگاری سے کام لیا جاتا ہے اور ایک اچھا خودنوشت نگار اپنے لفظوں کی ترتیب سے ”منظر“ کی تعمیر کرتا ہے۔ ”جو یاد رہا“ میں اس ”نقش نگاری“ کے اچھے نمونے ملتے ہیں۔ وہ چاہے اورئی کا مکان ہو یا پھر بھوپال کی

شاہراہیں۔مصنف نے پوری تصویرِ زندگی کولفظوں اور جملوں سے سجا دیا ہے۔شہر بھوپال کا یہ نقشہ ملاحظہ کیجئے

"اسٹیشن سے باہر نکلتے ہی تانگا جس سڑک پر دوڑا وہ دودھ میں نہائی ہوئی تھی اور ایسا لگتا تھا جیسے کسی نے اس پر چاندنی بچھادی ہو۔۔۔سڑک پر یہ کیسی روشنی تھی جو آنکھوں کوٹھنڈک پہنچاتی اور ساتھ ساتھ چلتی۔دونوں طرف اونچے اونچے کھمبے تھے جواوپر جا کر خیرمقدم کے لئے جھک جاتے اور روشنی میں جیسے آنکھیں بچھاتے۔۔۔تانگہ گھنی آبادیوں کے علاقے داخل ہوا تو ایک عجیب ہی دنیا نظر آئی اوراونچی اور موٹی فصلیں (فصیلیں) ساتھ ساتھ چلنے لگی تھیں۔جہاں سڑک مڑتی یہ فصلیں برجیوں میں تبدیل ہوجاتیں۔ان فصیلوں میں کہیں کہیں پھاٹک تھے۔ایسی ہی ایک سڑک جس کے ایک طرف فصیل تھی اور دوسری طرف پتھر کا بنا ہوا ایک بڑا سا مکان اور پھر ایک ٹیلا،تانگہ ذرا سا رکا،پھر بائیں جانب مڑا اور ایک چھوٹے سے میدان میں داخل ہوگیا۔(۸۵)

مصنف نے شہر لکھنؤ کا ذکر بھی اسی طرح کیا ہے۔یہاں کے محلوں اور گلیوں،کوچوں سے انھیں اچھی خاصی واقفیت تھی۔ان محلوں اور گلیوں کا ذکر اس کتاب میں ہمیشہ کے لئے محفوظ ہوگیا۔محمد حسن کے گھر کا پتہ کس عمدہ انداز میں تحریر کرتے ہیں معلوم ہوتا ہے جیسے نظریں ان راہوں پر سفر کررہی ہوں

"قیصر باغ کے چوراہے سے لاٹوش روڈ میں داخل ہوا جائے تو تھوڑی دور چل کر ایک بے نام سا چوراہا پڑتا ہے جہاں سے بائیں ہاتھ کی طرف کی سڑک ماڈل ہاؤسیز کی طرف چلی جاتی ہے اور دائیں ہاتھ کی نظیر آباد کی جانب۔اسی سڑک پر دس پندرہ قدم چلنے کے بعد دائیں جانب ایک راستہ پھوٹتا ہے جس پر تیسرے یا چوتھے مکان میں،جو دومنزلہ ہے،محمد حسن رہتے تھے۔"(۸۶)

عابد سہیل کی تحریروں میں خواہ وہ فکشن سے متعلق ہوں یا غیر فکشن سے،تشبیہ،استعاروں کے علاوہ "اشاروں" کے پیچ وخم بھی موجود رہتے ہیں۔یہ اشارے کبھی اس قدر لطیف اور طنزیہ ہوتے ہیں کہ قاری زیرلب مسکرانے لگتا ہے۔مثال کے طور پر استادالشعرا پر یہ جملہ ملاحظہ کیجئے

"اثر صاحب نے شاید یہ سوچ کر کہ شاعری میرے بس کی بات نہیں ایک دن کہا "میاں اب آپ کو اصلاح کی ضرورت نہیں" اب سوچتا ہوں کہ یہ اچھا ہی ہوا

ورنہ برسوں مشاعروں کا چارہ بننے کے بعد آج استاد شعرا میں شمار ہوتا، کہ یہ تمغہ
شاعری کو نہیں عمر کو ملتا ہے۔" (۸۷)

اس اقتباس کا آخر جملہ "یہ تمغہ الخ" کتنا حساس اور فکر انگیز ہے کہ اردو شاعری میں فن سے زیادہ عمر کی طوالت کو اہمیت دی جانے لگی ہے۔ اسی طرح کا ایک جملہ انھوں نے صفحہ 199 پر لکھا ہے جس میں انھوں نے پوری زندگی کی روداد سنا دی۔ یہ جملہ کُشتی کے اقتباس سے منسلک ہے جب عابد سہیل نے سمنانی بھائی کو ہرا دیا تھا اور یہ فتح محض اتفاقی تھی کیونکہ نا آزمودہ کار تھے اور سمنانی بھائی اس میدان کے پرانے کھلاڑی۔ اس فتحیابی پر مصنف لکھتے ہیں

"بظاہر تو خوش تھا لیکن اندر سے یہ ضرور جانتا تھا کہ اس جیت کی حیثیت "اتفاق"
سے زیادہ نہیں۔ زندگی میں جو تھوڑی بہت کامیابیاں ملیں، ان کی حیثیت بھی
ایسی ہی ہے اور جہاں جہاں آنکھیں کھلی رہیں وہاں وہاں چِت اور پٹ دونوں
دوسروں ہی کی رہیں۔" (۸۸)

اس جملے میں نہ صرف یہ کہ زندگی کا عکس موجود ہے بلکہ کرب اور غم پوری دنیا آباد ہے۔

اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ اشارے اور استعارے کہیں کہیں اتنے زیادہ پیچیدہ ہو گئے ہیں کہ سمجھ سے پرے ہیں۔ اس کی ایک وجہ قاری کی مصنف کے داخلی معاملات سے ناواقفیت بھی ہے۔ ایسا ہی ایک اقتباس انھوں نے اپنی شادی کے بارے میں لکھا ہے۔ معاملہ اتنا سنگین ہے کہ قاری کی دلچسپی بڑھتی چلی جاتی ہے لیکن جہاں پر معاملہ سمجھنے کا موقع آتا ہے، قاری کے ہاتھ کچھ نہیں لگتا۔ عابد سہیل کی شادی 1958 میں ہوئی تھی اور رخصتی 1964 میں۔ ایسا کیوں ہوا اس کی مکمل تشریح نہیں۔ بقول مصنف مشہور یہ تھا کہ عابد سہیل رپیوں اور جائداد کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ اس تمام معاملہ کی روداد کے بعد جب قاری کو محسوس ہوتا ہے کہ اب راز سے پردہ اٹھے گا تو اقتباس کچھ ان الفاظ پر مشتمل نظر آتا ہے

"آشیانہ شاخ نازک پر بنا تھا اور جڑوں میں بھر دی گئی تھی بارود۔ چنانچہ کبھی
پلاسٹر جھڑتا، کبھی ایک اینٹ گرتی، کبھی دوسری اور پھر خشت باری کا جو سلسلہ
شروع ہوا وہ ماشاءاللہ جاری رہا۔" (۸۹)

یہ حقیقت ہے کہ اس اقتباس سے معاملہ تو نہیں سلجھتا مگر مصنف کے طرز بیان اور تشبیہوں اور استعاروں کے استعمال پر قدرت کا اندازہ ضرور ہو جاتا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ پوری کتاب کو ایک سوگوار فضا اپنے احاطہ میں لئے ہوئے جس میں شکایات اور درد دل بیان کیا گیا ہے۔ اس فضا سے قاری کی طبیعت بوجھل تو نہیں ہوتی لیکن طبیعت کی تازگی پر ضرور اثر پڑتا ہے۔ اس لئے مصنف نے جا بجا مزاحیہ انداز کو بھی اختیار کیا ہے مگر یہ مقامات پوری کتاب میں بہت کم ملتے ہیں۔ مثال کے طور پر چند سطریں پیش خدمت ہیں۔

میں صباح الدین صاحب کے سامنے سگریٹ نہیں پیتا تھا، بس یونہی، کوئی خاص وجہ نہ تھی علاوہ اس کے کہ وہ صلاح الدین بھائی کے بڑے بھائی تھے۔ لیکن کام کرتے کرتے دو گھنٹے ہو گئے تو طلب بڑھی۔ میں باہر جا کے دو چار کش لگانے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ صباح الدین صاحب نے سگریٹ کی ڈبیہ نکالی۔ اب صبر کا یارا نہ رہا۔ ایک سگریٹ مانگ ہی لی۔ انھوں نے گھور کے دیکھا اور سگریٹ بڑھا دی۔ تھوڑی دیر کے بعد انھوں نے پان کی ڈبیہ کھولی اور پان منہ میں رکھ لیا۔ میں نے کہا تو کچھ نہیں لیکن ہاتھ بڑھا دیا۔ اب انھوں نے زیادہ دیر تک گھور کے دیکھا اور پان دیتے ہوئے پوچھا

" آپ پان بھی کھاتے ہیں؟ آواز سخت تھی اور چہرے پر تناؤ۔

میں نے کوئی جواب نہ دیا لیکن جونہی انھوں نے ڈبیا سے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی میں تمبا کو گرائی میں نے اپنا ہاتھ پھر بڑھا دیا۔

اب ان کے غصے کا پارا یک چڑھ گیا اور انھوں نے نہایت سخت لہجے میں کہا۔

" آپ تمبا کو بھی کھاتے ہیں؟"

"میں ہر وہ کام کرتا ہوں جو آپ کرتے ہیں،" میں نے کہا۔

" تب تو مجھے انیس سے شکایت کرنا پڑے گی۔" بے ساختہ ان کے منہ سے نکل گیا لیکن جو ہی اس کے معنی سمجھ میں آئے تو ہنسنے لگے۔ (۹۰)

(انیس عابد سہیل کی نصف بہتر کا نام ہے)

اقبال سمان کی جیوری میں عابد سہیل کو ممبر بنایا گیا۔اس ممبر شپ پر عابد سہیل کو حیرانی تھی کہ بنا کسی زور اور سفارش کے یہ کیسے ممکن ہو گیا۔ جب عابد سہیل اس جیوری کے دیگر ممبرز کے ساتھ فیصلہ کر کے واپس آئے تو ایک صاحب نے اس راز سے پردہ اٹھاتے ہوئے کہا کہ تمھیں ہزار کوششوں کے بعد جیوری کا ممبر بنایا اور تم نے میرے نام کی پیروی ہی نہیں کی۔ عابد سہیل کو تب معلوم ہوا کہ انھیں جس نام کی پیروی کرنے کے لئے ممبر بنایا گیا انھوں نے اس کے بجائے ایک مستحق کو ایوارڈ دلا دیا۔مصنف نے یہ روداد لکھنے کے بعد ان صاحب کے ایوارڈ ملنے کا حال بھی بیان کیا ہے مگر کتنا خوبصورت انداز ہے اور اشاروں کنایوں میں کتنی بڑی بڑی باتوں کی پردہ کشائی کی ہے کہ پورا نظام ہی برہنہ نظر آتا ہے۔ ملاحظہ کیجئے

> "خیر "غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس" کے سہارے انھوں نے ہمت نہ ہاری اور خوش قسمتی سے ایک سال ان کے سارے دوست انصاف کی ترازو کے ایک پلڑے میں انھیں بٹھا کر دوسرے پلڑے میں باٹ رکھنا ہی بھول گئے۔ظاہر ہے انھیں "سرخرو" ہونے سے کون روک سکتا تھا۔" (۹۱)

اس کتاب میں ایسے بہت سے مقامات ہیں جہاں مصنف نے لفظوں کا ڈھیر لگانے کے بجائے ایجاز سے کام لیا ہے۔ عابد سہیل کے ایک کلاس فیلو رشید کوثر شاعر تھے۔ان ہی کی صحبت کے سبب عابد سہیل نے اپنا ادبی سفر شاعری سے شروع کیا اور والد کی یاد میں عابد ظفر نام لکھنے لگے تھے۔کچھ دن تک یہ کاروبار عشق چلتا رہا۔لیکن پھر طبیعت نے شاعری ترک کر دی۔لیکن ادبی ذوق ان میں باقی رہا۔ یہاں تک کہ وہ بچپن کا شعر بھی انھیں یاد رہا جو مدینہ رسالہ کی پیشانی پر لکھا دیکھا تھا۔شعر تھا

معجزہ شق القمر کا ہے "مدینہ" سے عیاں
مہ نے شق ہو کر لیا ہے دین کو آغوش میں

یہ شعر سمجھ میں نہ آنے کے باوجود انھیں اچھا ضرور لگتا تھا مگر جب شعور میں شاعری کا شوق شامل ہو گیا تو اس کی گرہ بھی اپنے آپ کھل گئی۔ عابد سہیل نے کتنے کم الفاظ میں اس شعر کا مطلب بیان کیا ہے ملاحظہ کیجئے

> "پھر جب نویں درجہ میں پہنچا اور بطور مضمون اردو کے علاوہ فارسی پڑھنا شروع کی تو ایک دن آپ ہی آپ "م" اور "ہ" کے درمیان "دین" ابھر آیا اور چاند چمکنے لگا۔" (۹۲)

اس شعر کی تشریح میں کئی ورق لکھے جا سکتے ہیں لیکن جس خوبصورت انداز اور کم الفاظ میں مندرجہ بالا تشریح

کی گئی ہے وہ شاید ممکن نہ ہو۔اس شعر میں صنعت تلمیح اور ایہام دونوں پائے جا رہے ہیں کیونکہ یہاں معجزۂ رسول کا ذکر ہے جب انھوں نے چاند کے دو ٹکڑے کئے تھے اور ساتھ میں معنی بعید بھی موجود ہیں جس کا انکشاف لفظوں پر غور کرنے سے ہوتا ہے، جس کی طرف عابد سہیل نے اشارہ کیا ہے۔

لفظ مدینہ کے شروع اور آخری حرف کو ملایا جائے تو مجموعہ "مہ" ہوتا ہے اور اسی کے درمیان دین کا لفظ موجود ہے گویا کہ دین کو "مہ" نے شق ہو کر اپنی آغوش میں لیا ہے اور دوسرا معنی یہ ہیں کہ جب رسولؐ سے ثبوت صداقت کا مطالبہ ہوا تو رسول نے بھی "مہ" یعنی چاند کو شق کر کے دین کو بچایا تھا۔اب دوبارہ شعر دیکھئے

معجزہ شق القمر کا ہے "مدینہ" سے عیاں
مہ نے شق ہو کر لیا ہے دین کو آغوش میں

یہ تشریح مصنف کے زبان پر قدرت کا پتہ دیتی ہے۔

کتاب کا ایک اور اقتباس ایجاز کی عمدہ مثال میں پیش کیا جا سکتا ہے۔اس اقتباس کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ اس میں مصنف کی مکمل شخصیت ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔محض چند سطروں میں عابد سہیل نے اپنا ماضی اور حال دونوں کا خاکہ کھینچ دیا۔اس اقتباس کا ایک ایک لفظ پوری داستان اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔

> "میں عام طور پر جھوٹ نہیں بولتا، نقصان کا خطرہ مول لے کر بھی سچائی سے گریز نہیں کرتا لیکن یہ بھی بتا دوں کہ خاصا ڈرپوک قسم کا انسان ہو گیا ہوں اور صرف اپنی بزدلی کے سبب اس وقت بھی خاموشی اختیار کر لیتا ہوں جب لوگ اپنے جھوٹے دعووں میں مجھے اس طرح شامل کر لیتے ہیں گویا میں اس سب کا گواہ ہوں۔میں ہمیشہ ایسا نہ تھا۔ابّا کے انتقال سے قبل خاصا دبنگ تھا لیکن بعد کے حالات اور ایک "حادثے" نے، جس کی تفصیلات بھی اپنی بزدلی کے سبب بیان نہیں کر سکا ہوں، تباہ کر لیا۔۔۔تاہم ان حالات سے مجھے فائدہ بھی ہوا۔۔۔باہر کی ناقابل برداشت دنیا سے فرار اور اپنے آپ میں گم رہ کر، میں اپنے کمرے میں ایک دنیا آباد کر لیتا ہوں، گھنٹوں سر جھکائے کام کرتا رہتا ہوں۔اس "سہولت" نے، مجھے صحافتی دنیا میں ایک اچھا نہیں تو محنتی اور بھروسے کے قابل کارکن ضرور بنا دیا اور چھوٹا موٹا ادیب بھی۔" (۹۳)

المختصر "جو یاد رہا" کا شمار اکیسوی صدی کی ان چند آپ بیتیوں میں ہوتا ہے جن کو اردو کی نمائندہ خودنوشتوں کا

درجہ دیا جاسکتا ہے۔ یہاں مصنف نے اپنی مہمات کے ذکر کے بجائے چشم کشا واقعات کو جگہ دی ہے۔ اپنے زمانے کے حالات کے ساتھ ساتھ احباب وعزیز دار کے ذکر کو بھی یہاں درج کر دیا ہے۔ یہ ذکر تقریباً ایک چوتھائی کتاب میں ہے۔جس میں ”میرے کرفرما“ عنوان کے تحت ڈاکٹر عبدالعلیم، فرحت اللہ انصاری، مرزا جعفر حسین، مقبول لاری، ڈاکٹر ک کے مسرا، سید صدیق حسن وغیرہ اور میرے ادبی دوست کے زیر عنوان رام لعل، احمد جمال پاشا، ڈاکٹر مسیح الزماں، نیر مسعود، رشید حسن خاں رتن سنگھ، اقبال مجید، لطیف صدیقی وغیرہ کے علاوہ میری محبتیں عنوان کے ساتھ آمنہ آپا، راجی سیٹھ، خواجہ رائق، اوشا، بشیر وارثی خواجہ انور، سدرشن وغیرہ کے خاکے لکھ دئے ہیں۔خودنوشت کے اس حصہ میں مصنف کی شخصیت کہیں کہیں پس پردہ چلی جاتی ہے جس کی وجہ سے یہ حصہ خاکہ نگاری سے زیادہ قریب ہو جاتا ہے مگر اس بات کا بھی اعتراف کرنا پڑے گا کہ جن واقعات کو عابد سہیل نے اس کتاب میں محفوظ کر دیا ہے وہ ذکر مذکورہ حضرات پر لکھی کسی دوسری کتاب میں ملنا مشکل ہے۔

کتاب کے شروع میں فیاض بھائی کا ذکر موجود ہے جو عابد سہیل کے پدری بھائی تھے جو فوج کی ملازمت سے بھاگ آئے تھے اور واپس نہ جانے کے لئے پاگل بن گئے تھے مگر دھیرے دھیرے پاگل پن کا اثر ان پر خاصہ دکھنے لگا تھا۔ان کا ذکر عابد سہیل نے بڑی شدومد کے ساتھ کیا ہے تمام کیفیات سے قاری کو آشنا کرایا ہے مگر پھر ایک دم سے فیاض بھائی کا کیا ہوا اس کا ذکر آگے نہیں ملتا جس کے سبب قاری کی تشنگی برقرار رہتی ہے۔یہی حال مصنف کی والدہ کے ذکر کے ساتھ ملتا ہے یہاں بھی شروع سے نصف کتاب تک مختلف مقامات پر عابد سہیل اپنی والدہ کا ذکر کرتے ہیں مگر پھر اچانک ان کی علی گڑھ منتقلی اور انتقال کا ذکر کر کے بات تمام کر دیتے ہیں جو پڑھنے والے کو نامکمل محسوس ہوتی ہے یعنی علی گڑھ کا سفر کیوں کیا، وہاں طبیعت اچانک کیسے خراب ہوئی وغیرہ وغیرہ۔

یہ کتاب عابد سہیل کی روداد حیات ہونے کے ساتھ ساتھ اودھ کی پچاس سالہ تاریخ کو اپنے دامن میں سمیٹے ہے۔ یہاں معلومات کا ذخیرہ ہے جس میں مخصوص دور کی وہ باتیں محفوظ ہوتی چلی گئی ہیں جن کے نقوش سوائے اس کتاب کے کہیں اور ملنا ممکن نہیں۔ بقول ڈاکٹر صبیحہ انور

> ”لکھنؤ کی سیاسی اور ادبی سرگرمیوں کی تفصیلات تو شاید کتابوں اور آرکائیوز کی فائلوں میں مل جائیں گی، مگر سماجی، ثقافتی، چہل پہل، رواداری، وضع داری اور وعدوں کی پاسداری کو جب تاریخی، تہذیبی، جذباتی اور فکری تناظر میں پرکھا جائے گا تو عابد سہیل کی ”جو یاد رہا“ کی ایک دستاویزی حیثیت ہوگی۔(۹۴)

بلاشبہ ”جو یاد رہا“ عابد سہیل کا ایک غیر معمولی کارنامہ ہے جسے غیر افسانوی ادب میں ہمیشہ قدر کی نگاہ سے

دیکھا جائے گا۔اس باب کے آخر میں "جویادرہا" کے تعلق سے چند ناقدین کی آرا کو بھی درج کیا جارہا ہے تاکہ ادب میں اس فن پارہ کی اہمیت کو سمجھا اور پرکھا جاسکے۔

"عابدسہیل کا سروکار ادب سے رہا ہے اور صحافت سے۔ وہ سیاسی آدمی تھے اور ہیں،لیکن انھوں نے سیاست کے داؤ پیچ نہیں کھیلے، خدمت خلق کے بہانے خلق کو لوٹا نہیں، انھوں نے سیاست یا صحافت یا ادب کو آزوقۂ حیات سے زیادہ وظیفہ حیات کی طرح برتا ہے۔ انھیں اپنے بارے میں وہ غلط فہمی بھی نہیں جو تقریباً ہر خودنوشت نگار کو ہوتی ہے کہ دنیا میرے ہی جان ناتواں کے سارے چل رہی ہے۔ عابدسہیل نے ایسی خودنوشت لکھی ہے جو زندگی نامہ بھی ہے اور زندگی کی طرح دلکش، تخلیقی کارنامہ بھی۔"(۹۵)

شمس الرحمان فاروقی

"میرے خیال میں Best Sellers کی طرح "جویادرہا" ایک پرشور، متنوع، گہما گہمی سے لبریز، سفاک حدتک کلی اور بیباک زندگی کا گرما گرم کلامیہ بنانے کے لئے نہیں لکھی گئی ہے اور نہ "جویادرہا" میں جی گئی زندگی فرانس کے Painters کی طرح ہی ایک مریضانہ تشنج کی مسلسل کیفیت میں بسر ہوئی ہے مگر اس بات کا احتمال ضرور ہے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ مصنف کی یاد نے انھیں وہی یاد دلایا اور وہی لکھنے کی ترغیب دی جوان کی فطری طور پر احتیاط پسند طبیعت کی کسوٹی پر کھری اتری یا جس میں زیادہ تر مصنف کی شخصیت کے کسی اچھے پہلو کو تابناک بنانے کے موقع کا استعمال ہوا ہو۔ ایسا ہر جگہ تو محسوس نہیں ہوتا مگر مجموعی تاثر یہی ابھرا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ اپنی ہی کمزوریوں اور کمینگیوں کے بخئے ادھیڑنے کا فن اگر سنسنی خیزی پیدا کرنے کے لئے نہ ہو تو نسبتاً خاصہ مشکل فن ہے کیونکہ اس صورت میں یہ فن انسان کی تہذیب کرنے اور اسے زندگی کا عمدہ وژن عطا کرنے میں کسی حد تک مدد تو کرتا ہی ہے اس پہلو سے عابد

کی یہ تحریر بہ وجوہ اتنی وزن دار خواہ نہ ہو لیکن اس وصف کا معترف تو ہونا پڑے گا کہ مجموعی طور پر یہ سوانح آج کے عام ادبی قاری کے لئے ذریعہ انبساط بن جائے گی۔"(۹۶)

اقبال مجید

۔۔۔اقدار کو بدلتے ہوئے اخلاق و ایثار کو عابد سہیل نے مختلف افارد و واقعات کے ذریعہ بڑے ہی دلچسپ اور معنی خیز نداز میں پیش کیا ہے جس سے یہ کتاب صرف ایک شخص کی ایک سادہ سپاٹ سی سوانح نہ ہو کر ایک عہد کی تہذیب و معاشرت کی دستاویز بن گئی ہے۔(۹۷)

پروفیسر علی احمد فاطمی

یہ کتاب مجھے دوسری خودنوشتوں سے مختلف لگی۔اس میں جو کچھ کہا گیا ہے اس میں سچائی نظر آئی، ویسے اگر کوئی بات صناعی کی جھلمل کے ساتھ اس طرح پیش کی جائے کہ سچ لگے تو یہ بھی تو فن کاری ہوئی۔اس کتاب کی کارفنگ یہی ہے کہ اس میں صناعی دکھائی نہیں دیتی۔(۹۸)

صادقہ نواب سحر

حواشی

(۱) ترجمہ ماخوذ: اردو میں خودنوشت سوانح حیات، ڈاکٹر صبیحہ انور، صفحہ 17، ایم آر پبلی کیشنز 2021

(۲) اردو خودنوشت فن وتجزیہ، وہاج الدین علوی، لبرٹی آرٹ پریس پٹودی ہاؤس دریا گنج نئی دہلی، صفحہ 41)

(۳) کالا پانی المعروف بہ تواریخ عجیب، مولانا جعفر تھانیسری، عبدالعزیز تاجر کتب کشمیری بازار لاہور

(۴) اردو میں خودنوشت سوانح حیات، ڈاکٹر صبیحہ انور، صفحہ 150، ایم آر پبلی کیشن 2021

(۵) کالا پانی المعروف بہ تواریخ عجیب، مولانا جعفر تھانیسری، عبدالعزیز تاجر کتب کشمیری بازار لاہور

(۶) خودنوشت سوانح حیات نساخ، عبدالسبحان (مرتب) ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ صفحہ 1

(۷) خودنوشت سوانح حیات نساخ، عبدالسبحان (مرتب) ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ صفحہ 159

(۸) داستان غدر ظہیر دہلوی، مرتب آغا محمد طاہر نبیرۂ حضرتِ آزاد، صفحہ 1، مطبع کریمی لاہور

(۹) داستان غدر، ظہیر دہلوی، صفحہ 165، اکادمی پنجاب، ادبی دانی منزل لاہور

(۱۰) داستان غدر، ظہیر دہلوی، صفحہ 208، اکادمی پنجاب، ادبی دانی منزل لاہور

(۱۱) داستان غدر، ظہیر دہلوی، صفحہ 163، اکادمی پنجاب، ادبی دانی منزل لاہور

(۱۲) مولانا ابوالکلام آزاد فکر وفن، ڈاکٹر ملک زادہ منظور، اتر پردیش اکادمی، 2007، صفحہ 191

(۱۳) آپ بیتی، خوجہ حسن نظامی دہلوی، خواجگان پبلی کیشنز لاہور 1990 صفحہ 3

(۱۴) آپ بیتی، خوجہ حسن نظامی دہلوی، خواجگان پبلی کیشنز لاہور 1990 صفحہ 10

(۱۵) اعمال نامہ، سرسید رضا علی، ہندوستانی پبلشرز دہلی 1943، صفحہ (ح)

(۱۶) اعمال نامہ، سرسید رضا علی، ہندوستانی پبلشرز دہلی 1943، صفحہ (یٰ)

(۱۷) خوں بہا، حکیم احمد شجاع، تعارف، ص 10، تاج کمپنی، لاہور 1943

(۱۸) مابدولت، شوکت تھانوی، صفحہ 9،

(۱۹) مابدولت، شوکت تھانوی، صفحہ 25۔26 ادارہ فروغ اردو دہلی، 1945

(۲۰) ناقابل فراموش، دیوان سنگھ مفتون، صفحہ 7، نوائے وقت پبلی کیشنز لمیٹڈ لاہور 1957

(۲۱) شاد کی کہانی شاد کی زبانی، پروفیسر محمد مسلم، انجمن ترقی اردو (ہند) علیگڑھ، 1958 ص 248"

(۲۲) شاد کی کہانی شاد کی زبانی، پروفیسر محمد مسلم، انجمن ترقی اردو (ہند) علیگڑھ، 1958 ص 205"

(۲۳) یادوں کی بارات، جوش ملیح آبادی مشہور آفسٹ پریس کراچی، 1970، صفحہ 666

(۲۴) مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زبان میں، خواجہ غلام السدین، ص 18

(۲۵) زرگزشت، مشتاق احمد یوسفی، فائن آفسیٹ پریس شاہدرہ، دہلی 2000، ص 10)

(۲۶) (زرگزشت، مشتاق احمد یوسفی، فائن آفسیٹ پریس شاہدرہ، دہلی 2000، ص 9)

(۲۷)(زرگزشت،مشتاق احمد یوسفی، فائن آفسیٹ پریس شاہدرہ، دہلی 2000،صفحہ 246)

(۲۸) آپ بیتی،مولانا عبدالماجد دریا آبادی،فردوس،لکھنؤ 1989،ص 12)

(۲۹)(بیتی کہانی،مصنف شہر بانو،مرتب وپیشکش ڈاکٹر معین الدین عقیل،عرفان افضل پرنٹر لاہور،2006،ص 18)

(۳۰)(آزادی کی چھاؤں میں بیگم انیس قدوائی،قومی ایکتا ٹرسٹ ص 129،)

(۳۱)(خوابی باقی ہیں،خلیق انجم کتاب نما خصوصی شمارہ پروفیسر آل احمد سرور شخصیت اور ادبی خدمات،جلد 33،شمارہ 5)

(۳۲)جو یاد رہا،عابد سہیل،صفحہ 18-19،اردو اکادمی دہلی 2012

(۳۳)جو یاد رہا،عابد سہیل،صفحہ 22-23اردو اکادمی دہلی 2012

(۳۴)جو یاد رہا،عابد سہیل،صفحہ 24،اردو اکادمی دہلی 2012

(۳۵)جو یاد رہا،عابد سہیل،صفحہ 25-24،اردو اکادمی دہلی 2012

(۳۶)جو یاد رہا،عابد سہیل،صفحہ 29،اردو اکادمی دہلی 2012

(۳۷)جو یاد رہا،عابد سہیل،صفحہ 28،اردو اکادمی دہلی 2012

(۳۸)ایضاً صفحہ 228

(۳۹)ایضاً صفحہ 54

(۴۰)ایضاً صفحہ 43

(۴۱)ایضاً صفحہ 61

(۴۲)جو یاد رہا،عابد سہیل،صفحہ 66،اردو اکادمی دہلی 2012

(۴۳)جو یاد رہا،عابد سہیل،صفحہ 71،اردو اکادمی دہلی 2012

(۴۴)جو یاد رہا،عابد سہیل،صفحہ 71،اردو اکادمی دہلی 2012

(۴۵)جو یاد رہا،عابد سہیل،صفحہ 74،اردو اکادمی دہلی 2012

(۴۶)جو یاد رہا،عابد سہیل،صفحہ 86،اردو اکادمی دہلی 2012

(۴۷)جو یاد رہا،عابد سہیل،صفحہ 99،اردو اکادمی دہلی 2012

(۴۸)ایضاً صفحہ 133

(۴۹)ایضاً صفحہ 92

(۵۰)ایضاً ص 233

(۵۱)ایضاً صفحہ 216

(۵۲)ایضاً صفحہ 76

(۵۳)جو یاد رہا،عابد سہیل،صفحہ 71،اردو اکادمی دہلی 2012

(۵۴)جو یاد رہا،عابد سہیل،صفحہ 235،اردو اکادمی دہلی 2012

(۵۵)جو یاد رہا،عابد سہیل،صفحہ 113.114،اردو اکادمی دہلی 2012

(۵۶)جو یاد رہا،عابد سہیل،صفحہ 113،اردو اکادمی دہلی 2012

(۵۷)جو یادرہا، عابد سہیل، صفحہ 170، اردو اکادمی دہلی 2012

(۵۸)جو یادرہا، عابد سہیل، صفحہ 85،، اردو اکادمی دہلی 2012

(۵۹)ایضاً صفحہ 171

(۶۰)ایضاً صفحہ 176-175

(۶۱)ایضاً صفحہ 178

(۶۲)ایضاً صفحہ 239-240

(۶۳)جو یادرہا، عابد سہیل، صفحہ 241، اردو اکادمی دہلی 2012

(۶۴)جو یادرہا، عابد سہیل، صفحہ 244، اردو اکادمی دہلی 2012

(۶۵)جو یادرہا، عابد سہیل، صفحہ 242،، اردو اکادمی دہلی 2012

(۶۶)ایضاً صفحہ 176

(۶۷)ایضاً صفحہ 294

(۶۸)ایضاً صفحہ 32

(۶۹)ایضاً صفحہ 32-33

(۷۰)ایضاً صفحہ صفحہ 33-334

(۷۱)ایضاً صفحہ 57

(۷۲)ایضاً صفحہ 58

(۷۳)جو یادرہا، عابد سہیل، صفحہ 147، اردو اکادمی دہلی 2012

(۷۴)جو یادرہا، عابد سہیل، صفحہ 139، اردو اکادمی دہلی 2012

(۷۵)جو یادرہا، عابد سہیل، صفحہ 36، اردو اکادمی دہلی 2012

(۷۶)جو یادرہا، عابد سہیل، صفحہ 161، اردو اکادمی دہلی 2012

(۷۷)جو یادرہا، عابد سہیل، صفحہ 78، اردو اکادمی دہلی 2012

(۷۸)جو یادرہا، عابد سہیل، صفحہ 414، اردو اکادمی دہلی 2012

(۷۹)جو یادرہا، عابد سہیل، صفحہ 462، اردو اکادمی دہلی 2012

(۸۹)جو یادرہا، عابد سہیل، صفحہ 37، اردو اکادمی دہلی 2012

(۸۱)جو یادرہا، عابد سہیل، صفحہ 464، اردو اکادمی دہلی 2012

(۸۲)جو یادرہا، عابد سہیل، صفحہ 453، اردو اکادمی دہلی 2012

(۸۳)جو یادرہا، عابد سہیل، صفحہ 457، اردو اکادمی دہلی 2012

(۸۴)جو یادرہا، عابد سہیل، صفحہ 458، اردو اکادمی دہلی 2012

(۸۵)ایضاً صفحہ 64-63

(۸۶)ایضاً صفحہ 634-35

(۸۷)ایضاً صفحہ 209

(۸۸)ایضاً صفحہ 199

(۸۹)ایضاً صفحہ 360

(۹۰)ایضاً صفحہ 466

(۹۱)ایضاً صفحہ 651

(۹۲)ایضاً صفحہ 37

(۹۳)ایضاً صفحہ 411

(۹۴)ایضاً احمد صفحہ 227

(۹۵)خبر نامہ شب خون، شمارہ 20، جنوری تا مارچ 2013، بحوالہ ایوان اردو، دہلی جون 2013، صفحہ 5

(۹۶)عابد سہیل کی سوانح ایک زندہ دوست کی نظر میں، اقبال مجید، سہ ماہی آمد، اپریل تا ستمبر 2014

(۹۷)عابد سہیل بند کتاب سے کھلی کتاب تک، شکیل احمد (مرتب)، ایم آر پبلی کیشنز 2016، صفحہ 53

(۹۸)عابد سہیل، ڈاکٹر صبیحہ انور (مرتبہ)، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ، 2019، صفحہ 93